www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2018

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا

دہلی

URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com , sales@ncpul.in

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 10 اکتوبر 2018

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چتر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مکالمہ	مدیر	4
شخصیت	بندے میں تھا دم کرم کا موہن	جویریہ قاضی	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		8
جہانِ نسواں	اکتوبر کی تین بڑی شخصیات	تسنیم بانو	9
	نذر سجاد حیدر کے ناول......	شگفتہ یاسمین	15
	اہنسا کا پجاری: مہاتما گاندھی	امریتا کماری پانڈے	20
	گاندھی جی کا مذہبی و اخلاقی تصور	فرحت زیبا	23
کہانیاں	نعمت غیر مترقبہ	شاہدہ شاہین	25
	خواب بانٹنے والی	ممتاز رفیق	28
	عید کا دن	کوثر بیگ	37
	سورج کی موت	سلمیٰ صنم	40
	بھولی ہوئی یادوں کی کسک	رضوانہ ساگر روزی	43
حسن سخن	سریتا جبین 52، آبگینہ عارف 53، پروین ام مشتاق، پونم یادو 54		
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		55
صحت	صحت مند بننے کے لیے کیجیے 13 تبدیلیاں		57
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	نگر نگر سے		61

مکالمہ

یوں تو ہندوستان کے ہر ایک شہری کے دل و دماغ میں گاندھی جی اس طرح بسے ہوئے ہیں جیسے گلاب میں خوشبو، ندی میں پانی یا سورج میں روشنی لیکن اکتوبر کا مہینہ بطورِ خاص اس عظیم شخصیت سے منسوب ہے جس نے دنیا کے عظیم غاصب ملک انگلستان کے خلاف حالتِ غلامی میں بغاوت کی ایسی آگ بھڑکائی کہ غرورِ انگلستان اس آتش بغاوت میں جھلس کر رہ گیا اور جس ملک کے حدود میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اس کی طنابیں کٹ گئیں اور اسے رفتہ رفتہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر متعدد ممالک کو بھی آزادی کا پروانہ دینا پڑا۔

موہن داس کرم چند گاندھی کے ایک شخص سے شخصیت بننے کی روداد نہایت بلیغ، جاں گسل لیکن حوصلہ افزا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا گاندھی جی کے راستے پر چلنے کے لیے کوشاں ہے۔ گاندھی نام ہے ایک عالمی تحریک کا نہ صرف عدمِ تشدد کا بلکہ مساوات کا۔ اس شخص کا ہر تجربہ پہلے خود سے شروع ہوتا تھا اور پھر کامیابی سے ہمکنار ہوتا تھا اس نے کبھی کسی کو اس کام کے کرنے کا حکم نہیں دیا جسے پہلے اس نے خود نہیں کیا ہو۔ اس نے ملک کے ہر حصے کا دورہ کیا لوگوں سے ملا بھانت بھانت کے رسم و رواج زبان ان کے طریقۂ عبادت رہن سہن ان کے رویہ اور لہجے سے بھی واقفیت حاصل کی اور پھر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس ملک کی سب سے بڑی خصوصیت انواع و اقسام کے لوگ اور ان سب کی الگ الگ روایتیں ہیں الگ الگ طریقہ کی خوراک ہے الگ الگ طریقہ کی بود و باش ہے حتیٰ کہ ایک ہی مذہب کے لوگ الگ الگ دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں الگ الگ طریقہ سے نماز پڑھتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود ملک کا ہر شہری اپنے مشترکہ ملک کی آن بان اور شان کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ گاندھی جی نے ہمیشہ اپنی راہ الگ بنائی اور اپنے قافلے میں سب سے آگے خود چلے۔ انگریزی سلطنت کے جبر کو عدمِ تشدد سے ملیامیٹ کر دینا نہ کل آسان تھا اور نہ آج آسان ہے لیکن چشم فلک نے اس ناممکن کو ممکن ہوتے ہوئے دیکھا۔ گاندھی ایک مذہبی شخص کا نام ہے لیکن اس نے کبھی بھی اپنے مذہب کو دوسروں کے لیے قابل تقلید نہیں بنایا انھوں نے ملک کے ہر شہری کو اپنے اپنے مذہب اور مسلک پر چلتے ہوئے تحریک آزادی میں اپنا رول ادا کرنے کے لیے کہا اور خود اپنی زندگی کا حصول آزادی کے لیے وقف کر دی۔ گاندھی ایک تحریک کا نام ہے اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ ایک شخص اپنی ذات کو صدیوں پر کیسے محیط کر دیتا ہے تو اسے حیات گاندھی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انھیں ایک ضد تھی کہ انسان اگر ارادہ کر لے تو پربت کو بھی رائی بنایا جا سکتا ہے اور اس کی زندہ مثال ہے عدم تشدد کی وہ تحریک جو دنیا کے سب سے بڑے سوپر پاور کے مقابلے اس نے کھڑی کی اور اس کا نتیجہ ساری دنیا کو حیران کر دینے کا باعث بنا۔ گاندھی جی کی پوری زندگی انسانی خصائص کا مجموعہ ہے۔ ان کے نزدیک عزت نفس ایک ایسا سرمایہ ہے جس کے ختم ہوتے ہی انسان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ نابرابری چاہے مادّی ہو مذہبی یا سماجی وہ اسے انسانی معاشرے کے لیے زہر سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی معاشرے کے ہر ایک فرد کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسان کی اسی طرح عزت کرے جس طرح وہ اپنی توقیر چاہتا ہے۔ مذہب گاندھی جی کے لیے ذاتی شے تھی ان کا صاف صاف یہی کہنا تھا کہ مذہب انسان کو انسانی خصائص پر کاربند رکھتا ہے کسی کی تکذیب نہیں سکھاتا۔ کذب و ریاکاری سے گاندھی جی کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور مادرِ وطن کے ہر شہری سے ان کا یہی مطالبہ تھا کہ اپنے وطن کی دل و جان سے خدمت کرتے ہوئے دیگر ممالک کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اکتوبر کا یہ شمارہ موہن داس کرم چند گاندھی کے نام سے منسوب کرتے ہوئے ہمیں فخر ہو رہا ہے۔ اسے ہم حسنِ اتفاق ہی کہیں گے کہ ماہ اکتوبر میں جہاں ہم یوم گاندھی مناتے ہیں وہیں سرسید احمد خاں اور اے پی جے عبدالکلام کا یومِ پیدائش بھی مناتے ہیں ان میں سرسید جو گاندھی سے قبل پیدا ہوئے جبکہ اے پی جے عبدالکلام آزادی کے بعد یہ ہمارے وہ لعل و جواہر ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علمی مستقبل کو روشن تر کیا ہے اور گاندھی کی طرح کبھی بھی اپنے مشن سے روگرداں نہیں ہوئے۔ آج بھی جب ہم ہندوستان کے آسمانِ علم کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں سرسید احمد خاں اور اے پی جے عبدالکلام دو روشن ستارے کی طرح اپنی تابندگی لٹاتے نظر آتے ہیں اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے تقریباً 100 سال بعد اے پی جے عبدالکلام پیدا ہوئے اور اپنی محنت اور لگن سے دنیا کے چند بڑے سائنسدانوں کی قطار میں جا کھڑے ہوئے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

بندے میں تھا دم
کرم کا موہن

جویریہ قاضی

میرے ہم وطنو! یہ خاک ہندوستان کئی فرقوں کا مرکب ہے۔ اے سرزمین ہند، اے ہندوستان کے صحراودشت اگر تجھ میں کوئی ٹیپواور حسرت نہیں تو کوئی باپو ہی پیدا کردے جس کے من مندر میں ایسی سہانی فضا ہو جس میں دیروحرم، شیخ وبرہمن سب برابر ہیں جس کی سرشت میں بے چینی کسک اور اضطراب ہے جو اس دنیا سے مطمئن نہیں اسی لیے کم عمری میں ہی آبلہ پائی کی ٹھان لی اور جان گیا کہ بندے کا انسان سے رشتہ کیا ہے اور اس رشتے کو کیسے نبھایا جاتا ہے۔ انسان آزاد کب ہوگا؟ جہالت، تعصب، تنگ نظری، دکھ اور درد کی زنجیریں کب ٹوٹیں گی؟ یہ منحنی سا شخص اتنا قوی احتجاج ہے جس کی بازگشت گونجتی رہے گی اور ایک ایسی دعا بھی جو بندوں کو ان کے رب کے قریب لاکر چھوڑے گی۔

کشیدہ کارِ ازل تجھ کو اعتراض کوئی
کہیں کہیں سے اگر زندگی رفو کرلوں

موہن داس سے باپو تک جستجو کا ایک سفر ایسے شخص کی کہانی ہے جسے ذلت نے تلاشِ ذات کے سفر پر آمادہ کیا اسی سفر میں اسے ادراک ہوا کہ وہ اپنی روحانی شناخت بھی کھو بیٹھا ہے جو اسے کرب میں مبتلا کر رہی ہے اور اسی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ اکیلا آدمی خود اپنا ہمسفر ہوتا ہے جو محدود سفر کو لامحدود کر دیتا ہے اور یہ درس دیتا ہے کہ دل جیتنا ہو تو سر جھکانا سیکھو کہ وہی سربلند ہوتا ہے۔ جہاں اتنا اندھیرا ہو کہ دن کی روشنی میں کچھ سجھائی نہ دے گاندھی اذانِ سحر ہے جب یہ سحر روشن ہوگی تو وہی زمانہ لوٹ آئے گا جب جسموں پہ چہروں کی روایت ہوگی۔

1846 عیسوی میں امریکہ کے مشہور منجم نے یورپ اور ایشیا کی سلطنتوں کے عروج وزوال کے متعلق پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ مشرق میں ایک انسان پیدا ہوگا جو اس زمانہ میں بلند مرتبہ ہوگا جس طرح بدھ نے ہندوستان کو، افلاطون نے ایران کو، کولمبس نے نئی دنیا کو راستہ دکھایا تھا اسی طرح جب وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کرے گا تو دنیا کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی حالت میں اور لوگوں کے جزبات میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کرے گا جسے اس سے پیشتر دنیا کی آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا وہ محبت کا پرچار کرے گا اس کے اصول سمندر کی لہروں کی طرح زبردست ہوں گے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہ کرے گا وہ تنہا اپنے کام کو شروع کرے گا اور اس کی مدد کے لیے کروڑوں آدمی تیار ہو جائیں گے جس کے نتیجہ میں ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ وہ امن وامان کا دیوتا ہوگا اس کے دامن حیات پر خون کا دھبہ نہ لگے گا اسے دنیا میں کوئی بددعا نہ دے گا اور پھر چشمِ بینا نے یہ نظارہ دیکھا کہ سیاہ کاری کے بادل چھٹے اور ایک روشنی نمودار ہوئی جس نے مردہ دلوں میں امید کی کرن جگائی اور سونے والوں کو بیدار کیا۔

آیا وطن کا شیدا بھارت کے بھاگ جاگے
پوری ہوئی تمنا بھارت کے بھاگ جاگے
ہو کر رہیں گی پوری ہندی کی آرزوئیں
گاندھی ہوا ہے پیدا بھارت کے بھاگ جاگے

بیسویں صدی کئی معنوں میں یادگار ہے جہاں دو عالمی جنگوں کی

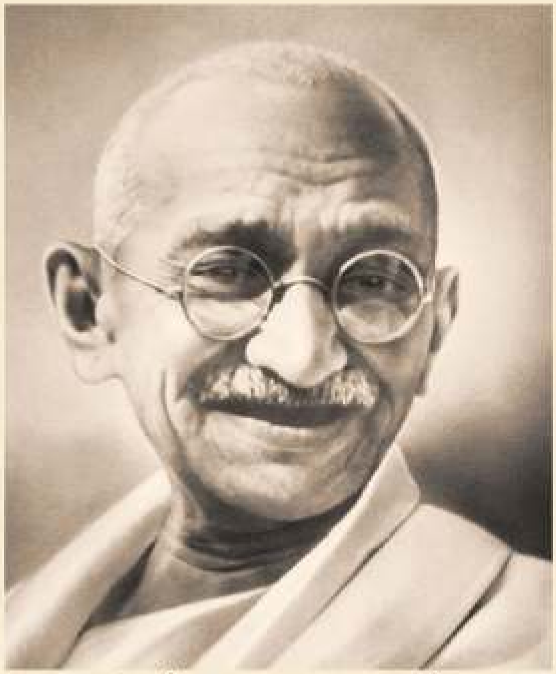

ہولناکیاں ہیں تو کئی ممالک نے غلامی سے نجات پائی۔ ظالموں کے پھلنے پھولنے کی بھی اور مصلحین کے اعجاز کی بھی ساتھ ہی ہندوستانیوں کے لیے صبر آزما بھی جہاں کی عوام شب تاریک کے ماہِ درخشاں کی منتظر تھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ نامساعد حالات انسان کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈھکیل دیتے ہیں جہاں اس کی جرأت جواب دے جاتی ہے اور دلوں پر بے حسی چھا جاتی ہے یہی حال ہم ہندوستانیوں کا برطانوی تسلط کے بعد ہوا 1857 کے بعد جور و جفا کا بازار گرم ہوا اور انگریز حکومت کو مضبوط تر کر گیا۔ ہندوستان کا ہر فرد غلامی کی زنجیروں سے رہائی چاہتا تھا لیکن کامیابی کی منزل تک لے جانے کے لیے ایسے باعمل رہنما کی ضرورت تھی جو ہر قسم کی انسانی خوبیوں سے آراستہ ہو اور نہ صرف آزادی کے حصول کا راستہ بتائے بلکہ باعمل زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی سکھائے خوش رنگ اور اعلیٰ دستورِ حیات بھی پیش کر سکے جو زندگی کی سنگلاخ راہوں میں سنگِ میل ثابت ہو۔ ہماری خوش قسمتی کہ گاندھی جی کی شکل میں وہ رہنما مل گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے اطراف انسان پر ہونے والے شرمناک مظالم کا مشاہدہ کیا پھر اپنے اندر جھانک کر نفرت حسد بغض اور ذات پات، بھید بھاؤ جیسی آلائشوں سے خود کو پاک کیا۔ پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف توجہ دی جو ان کے اذنِ سفر کے منتظر تھے۔ گاندھی جی مذہب انسانیت کے پیامبر بن کر ہندوستان میں ابھرے ان کی تعلیمات کا منبع انسانیت کی معراج تھا وہ صرف انگریزوں سے شخصی آزادی کے خواہاں نہیں تھے بلکہ تمام شر انگیزیوں کا خاتمہ چاہتے تھے جس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں انسانیت نابود ہو چکی تھی۔ گاندھی جی کی ایک ان مٹ سوغات ان کا تصورِ حیات ہے جس کی روشنی میں انسان اپنے انس کی نسبت تلاش کر سکتا ہے۔ جس کی نشان دہی ہر مذہب کے اوتاروں نے کی ہے۔

زندگی اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر ادھوری ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ مذہب سے ہی انسانی زندگی کو مقصدیت عطا ہوتی ہے انہوں نے جس طرزِ زندگی کو پیش کیا اس کا تانا بانا کچھ اصول تھے۔

انسانیت: دنیا کی تمام مخلوقات میں انسان کا درجہ اعلیٰ و افضل ہے اس لیے اسلام میں اسے اشرف المخلوقات کے نام سے یاد کیا گیا یہ بات اور ہے کہ انسان مادی دنیا کے حصول میں تنزلی کا شکار ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ انسان خدا کی اس مخلوق میں سے ہے جسے اپنے خالق کو پہچاننے کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے اس لیے اس کی روزمرہ زندگی کا مطمحِ نظر صرف مادی خوشی اور دیگر اشیا کی حصولیابی ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیات کا ارفع مقصد اپنے خالق سے قریب تر ہونا ہے۔

حسنِ اخلاق: حسنِ اخلاق کا تعلق دلوں کی صحت و صفائی سے ہے ہمارے دل جس درجہ پاک و صاف ہوں گے ہمارے خیالات اتنے ہی نکھرے ہوئے اور جذبات ستھرے رہیں گے اور خوش اخلاق انسان اجتماعی طور پر سوچنے کا عادی بن جاتا ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک ایک باکردار آدمی اپنے آپ کو کسی بھی ذمہ دار کام کے لائق بنا سکتا ہے اور یہی شخص بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

ادب : discipline ادب کی اہمیت اظہر من الشمس ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل ہے۔ گاندھی جی نے ادب کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی تربیت جبری نہیں ہونی چاہیے۔ ادبی تربیت کی پہلی درس گاہ گھر اور دوسری سماجی ماحول ہے۔ آج ادب کی عدم موجودگی ہمارے لیے سوہانِ روح بن گئی ہے۔

سچائی: سادہ زندگی اور بلند خیالی گاندھی جی کا اولین فلسفہ تھا وہ سچائی کو اپنی زندگی کا سنگِ بنیاد گردانتے تھے جب بھی کام کرنے کا جذبہ ابھرے تو اس جذبہ میں صداقت کا عنصر کس حد تک کارفرما ہے یہ دیکھنا ضروری ہے ورنہ کامیابی ہرگز ممکن نہیں۔

صحت و صفائی: صفائے قلب کے لیے صحت اور صفائی لازم و ملزوم ہیں جس کا رشتہ ماحول سے ہے اور ماحول کی نفاست کا دارومدار ہمارے طرزِ زندگی پر ہے انہوں نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ پسماندہ طبقہ کے گھروں

اور گندی سڑکوں کو خود صاف کیا لیکن ہنوز اس جذبہ میں وہ صداقت پیدا نہیں ہوئی جس کے وہ خواہاں تھے۔

آپسی رنجش: ہر مذہب نے آپس میں بیر رکھنے سے مخالفت کی ہے۔ گاندھی جی کے نزدیک یہ قابلِ مذمت ہے لیکن افسوس آج تک ہم ان کے اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔

مسکراہٹ: دانا کہتا ہے کوئی شخص اس وقت تک پوری طرح ملبوس نہیں ہے جب تک وہ مسکراہٹ کے جامے سے مزین نہ ہو۔ گاندھی جی کے چہرے پر ایک مسکراہٹ روشن رہتی تھی جس سے ہر کوئی حوصلہ پاتا تھا۔

عدم تشدد: یہ گاندھی جی کے بنیادی تصورات میں سے ہے جس میں جائز حقوق کی حصولیابی کے لیے سیدھا راستہ اختیار کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور کشت وخون کی مذمت کی گئی ہے۔

غلطی کا اقرار: غلطی کے امکان اور احساس سے آگاہی اور اس کا بلاخوف وخطر اقرار انسان کو انسان سے بالاتر بناتا ہے اس عمل سے انسان کی روحانی بالیدگی میں اضافہ ہوتا ہے اور ضمیر کو شفاف رکھتا ہے، گاندھی جی نے اعتراف گناہ کو صفائی قلب کے ایسے سوہان سے تشبیہ دی ہے جو اس کی سطح کو ہر بار صیقل کرتا چلا جاتا ہے۔

خاموشی: جنوبی افریقہ کی خانقاہ کے روحانی رہنما نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ یہ انسان، بہت حقیر اور کمزور ہے اور بسا اوقات ہم نہیں جانتے ہم کیا کہہ رہے ہوتے ہیں اگر ہم اس ملکوتی آواز کو سننا چاہیں جو ہماری ذات سے ہر لحمہ وابستہ ہے تو ہمارا خاموش رہنا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے خاموشی کے برت رکھنے شروع کیے اور اپنے اندر خاموشی کا تریاق جزب کرلیا جس کی بنا پر وہ روح کی سچائیوں کے بھیدوں کو پا سکے۔

غصہ: گاندھی جی نے غصہ کو ایسا پاگل پن بتایا ہے جو تعمیری کاموں کا سب سے بڑا دشمن ہے فطری طور پر اس سے چھٹکارا ناممکن ہے لیکن ضبط وتحمل سے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

بھید بھاؤ: گاندھی جی کے قومی یک جہتی کے خواب کی تعبیر اس کے ساتھ ممکن نہ تھی اس لیے انہوں نے اس کی بیخ کنی کی کوشش کی تا کہ ان قوموں کو ابھرنے کا موقع مل سکے جو اس زہر سے بے موت مر رہی تھیں ۔گاندھی جی کی اس تحریک میں ملکی مفاد مضمر تھا لیکن اس حقیقت سے آج بھی چشم پوشی کی جارہی ہے۔

عورت اور اس کے حقوق: عورت کو گاندھی جی ایثار اور قربانی کا مجسمہ تصور کرتے ہیں اور زندگی کے میدان میں وہی مقام عطا کرتے ہیں جو خود آدمی کو حاصل ہے۔ گاندھی جی نے حقوق نسواں کی حمایت میں اپنی تقریر میں کہا۔

I should treat the daughters and sons on a footing of perfect equality.

بزدلی: گاندھی جی ہندوستانی عورت کی سب سے بڑی کمزوری بزدلی سے بددل ہوتے ہیں انہوں نے عورتوں کو مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ہنگامی حالات میں صبر و استقلال سے کام لینے کی ترغیب دی ہے اور بزدلی کو بدترین گناہ قرار دیا ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی کی خوش حالی اور آسودگی کا راز راست گوئی کو اپنانے اور اہنسا کو برتنے میں ہے۔ گاندھی جی کا یہ تصور بہت خوش آئند ہے لیکن عملی طور پر مشکل ہے وہ سرمایہ داری کو ایسی چوری سمجھتے ہیں جو دوسروں کی محنت سے حاصل کی جاتی ہے گاندھی جی نے جس فقر وقناعت کی تلقین کی ہے اس کی اولین شرط سادگی ہے۔ سب سے اہم یہ کہ گاندھی جی کے تصورِ حیات کے خاکے ہند اسلامی فلسفہ کے رنگوں کی حسین آمیزش ہیں اس کی بنیاد بہت مضبوط اور گہری ہے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

آج سارا ملک بیداری کے بجائے خواب غفلت، محبت کی بجائے نفرت، تعمیر کی بجائے تخریب میں مبتلا ہے۔ کون کہتا ہے؟ گاندھی جی کا قتل ایک بار ہوا تھا! ہم روز اور مسلسل مارتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے قیمتی سرمایے کو فنا کرکے۔ بھولے ہوئے سبق کو دہرانے کا اب وقت آگیا ہے ۔ہم ان کی راہ سے دور یعنی اپنے آپ سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے ملک اور عوام سے دور ہو رہے ہیں۔ ان کی لافانی روح کو کوئی بندوق کی گولی نشانہ نہیں بنا سکتی جو بار بار زندہ ہوتی رہی ہے۔ انسانی برادری کی کھوج میں قتل ہونے والی روح کی زندگی کی ضمانت انسان کے سر سے ہے اور جب تک انسان زندہ ہے موہن داس کرم چند گاندھی کی مہان آتما زندہ رہے گی اور کہتے ہیں آتما اور پرماتما میں کوئی فرق نہیں ہوتا یہ پرماتما کا ایک انگ ہے جو اپنی یاترا ختم کرکے اپنی دشا کی طرف لوٹتی ہے لیکن ان گنت زمانوں کی دشا بدل کے رکھ دیتی ہے۔

□□□

Jaweria Kazi
Head Mistress, Momin Girls High School
Rais High School Campus
Bhiwandi, Distt. Thane-421302 (M.S)

شاعرات کے منتخب اشعار

ہے قہر بھی عتاب بھی لطف و عطا کے بعد
ملتا ہے روز زہر بھی مجھ کو دوا کے بعد

پیدا ہوا نہ ہم سا کوئی جان نثار پھر
رسم وفا ہی مٹ گئی اہل وفا کے بعد

وفا

میں پھو پھول سفر کر رہی تھی خوابوں کا
پھوار لائی تھی تحفہ نئے گلابوں کا

تیرا نام لکھتی ہیں انگلیاں ہواؤں میں
یہ بھی اک دعا ہوگی وصل کی دعاؤں میں

عشرت آفریں

اس انداز سے آئے غصہ میں وہ
کہ ہر ایک ستم مدعا ہو گیا

محبت کا اعجاز میں کیا کہوں
بڑھا درد بڑھ کر دوا ہو گیا

لیلیٰ

فکر تعمیرِ نشیمن میں ہے بلبل پھر بھی
دام صیاد بھی ہے برق شرر بار بھی

منحصر حوصلۂ دل پہ ہے ثابت قدمی
جادۂ شوق یہاں سہل بھی دشوار بھی

سیدہ فرحت

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں
وقعت حسن و مہر و ماہ گئی

اس نے نظریں اٹھا کے دیکھ لیا
عشق کی جرأت نگاہ گئی

ادا جعفری

ورق ورق میں سمو دے مجھے کتاب میں رکھ
میں زندگی ہوں مجھے وقت کے نصاب میں رکھ

مہک مہک کے بکھرتی میں اس کے آنگن میں
وہ اپنے گھر کا دریچہ اگر کھلا رکھتا

عفت زریں

خلوص آمیز جذبوں کی زباں مانی نہیں جاتی
دلوں کی بات چہروں سے پہچانی نہیں جاتی

غموں کا بحر بھی لوگوں کہیں پایاب ہوتا ہے
سفینہ ڈوب بھی جائے تو طغیانی نہیں جاتی

شمسہ کنول

میں کہ اپنی ذات میں اک پیاس کا صحرا رہی
کارواں در کارواں گزری مگر تنہا رہی

مرے خلوص کا اتنا سا بھی صلہ ہوتا
کبھی وہ مجھ سے مری طرح ملا ہوتا

شہناز نبی

ڈاکٹر تسنیم بانو

اکتوبر کی تین بڑی شخصیات

زمانہ قدیم میں ہندوستان کی قسمت کا ستارہ اُوج پر تھا۔ اس ملک میں ہر جانب خوشحالی اور فارغ البالی تھی۔ ہر شخص شاداں وفرحاں زندگی گزار رہا تھا۔ ماحول راحت افزا اور فضا خوشگوار تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد حکمراں طبقے کی عیش وعشرت، آپسی رنجشوں اور دیگر سماجی برائیوں، سیاسی لا پرواہیوں کے سبب پورے ملک کا اتحاد اور اعتماد ختم ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً ملک کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ ملک ٹکڑوں میں بٹتا چلا گیا، اس کی طاقت کم سے کمتر ہوتی چلی گئی، اس طرح سونے کی چڑیا کہلانے والا یہ ملک، لالچ بھری نظروں سے دیکھنے والے غیر ملکی طاقتوں کی غلامی کا شکار ہو گیا۔ حتیٰ کہ ان جابر اور ظالم طاقتوں کی لوٹ کھسوٹ سے ملک پوری طرح کنگال ہو گیا۔ ہندوستان کی یہ حالت کوئی گنتی کے دنوں تک نہ رہی بلکہ ہزاروں سال تک ملک کو غریبی، غلامی، مجبوری، مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑا۔

یعنی ہزاروں سال کے بعد سرزمین ہند میں تین ایسے نابغہ پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ملک کی حالت زار کو دیکھا، دوسرے نے ملک کی غلامی کو دیکھا، اور تیسرے نے دفاعی کمزوری کو، اور تینوں نے ہی اپنے اپنے میدان میں ملک کو خودکفیل بنانے کے اہم اقدامات کیے۔ ان سہ سرفراز جانثاروں کا تذکرہ ذیلی عنوانات کے طور پر اس طرح پیش کیا جارہا ہے۔

(1) رہبر ملک وملت۔ سرسیّد احمد خاں

(2) بابائے وطن۔ موہن داس کرم چند گاندھی

(3) فخر ہندوستان۔ اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام

(1) رہبر قوم وملت: سرسید احمد خاں

رہبر قوم وملت سرسید احمد خاں سیّد خاندان کے چشم وچراغ رہے، ان کے آباواجداد ایران کے صوبہ ہرات سے آکر دلی میں بس گئے تھے۔ سرسید احمد خاں کے دادا کو بادشاہ شاہ عالم نے سپہ سالار کے عہدہ پر فائز کر رکھا تھا۔ اسی اعلیٰ خاندان میں سرسیّد احمد خاں 17/ اکتوبر سنہ 1817 کو دلّی میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد آزاد منش شخص تھے، کوئی عہدہ اور ذمّہ داری لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے شاہی عہدوں سے انکار کردیا، لیکن دربار شاہی سے تعلقات قائم رکھے اور دربار میں آنا جانا جاری رہا۔ شاہی الطاف وعنایات کی نوازش ہوتی رہی۔ سرسیّد کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم وتربیت کی ساری ذمّہ داری ان کی والدہ کے ذمّہ رہی، جسے انھوں نے بخوبی سرانجام دیا۔ سرسیّد کی عمر 5/ سال کی تھی تو ان کی آیا کا انتقال ہو گیا۔ آیا کو سرسیّد سے اس قدر پیار تھا کہ انھوں نے مرتے وقت وصیّت کی کہ "میرے زیور احمد (سرسیّد) کو دے دیا جائے۔" ان کی ماں چاہتی تھیں کہ یہ زیور بیچ کر روپئے غریبوں میں تقسیم کردیے

جائیں ۔ ماں نے جب سرسیّد سے اپنے خیال کا اظہار کیا تو سرسیّد فوراً راضی ہوگئے۔اور زیور فروخت کر کے رقم غریبوں میں تقسیم کردی گئی۔لہٰذا غربا پروری کی تربیت سرسیّد کو بچپن سے ملتی رہی۔ بزرگوں کا احترام ،ظلم وزیادتی سے انحراف کی تعلیم بھی سرسیّد کو اپنی والدہ کی ہی تربیت سے ملی۔اس کی مثال اس ایک واقعے سے بھی لگائی جاسکتی ہے، جب سرسیّد کو اپنے گھر کے ایک بوڑھے نوکر کو تھپڑ مارنے کے سبب گھر سے نکال دیا گیا تو یہ اپنی خالہ کے یہاں تین دنوں تک چھپے رہے ، تیسرے دن ان کی خالہ نے انھیں لے جاکر سفارش کی۔لیکن سرسیّد کو اس وقت تک گھر کے اندر داخلے کی اجازت نہ ملی جب تک کہ وہ نوکر سے ہاتھ جوڑ کر معذرت نہ طلب کی اور نوکر کو راضی نہ کرلیا۔

’میں تین دنوں تک وہاں چھپا رہا،تیسرے دن خالہ صاحبہ ماں کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں ۔جب میں نے ڈیوڑھی میں جاکر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا‘

(حیات جاوید۔حالی صفحہ 42)

ایسی انسانیت پرور،انصاف پسند ماحول میں تربیت پاتے ہوئے سرسیّد نے رائج زمانہ تعلیم حاصل کی۔ قلعہ معلّی سے نجف جنگ کا خطاب حاصل کیا۔اور بادشاہ کے منظور نظر رہے لیکن قلعہ کی نوکری پسند نہ کی بلکہ انگریز گورمنٹ کی نوکری پسند کی۔ کیونکہ انھیں ملک ہندوستان کے ہونے والے حشر کا احساس ہوچکا تھا،عموماً ملک میں تعلیم کا فقدان تھا، اہل ثروت آرام طلب، لاپرواہ اور کوتاہ تھے۔ جہالت کا دوردورہ تھا۔جو تعلیم تھی بھی وہ بے سود تھی،عیش وعشرت کا فروغ تھا،دیسی راجہ،نواب اپنی شہنشاہی میں مست،عوام بدحال اور پست تھی۔ ایسے وقت میں 1857 کا انقلاب رونما ہوتا ہے اور برائے نام مغل سلطنت کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ راجاؤں، نوابوں، جاگیرداروں کی جائدادیں ضبط ہوتی ہیں،غربت وہلاکت، مصائب وآلام وفلاکت کا دور شروع ہوتا ہے۔جس کا تذکرہ پی۔سی۔ جوشی اپنی مشہور کتاب انقلاب 1857 میں اس طرح کرتے ہیں۔

’ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت زرخیز اور دولت مند ملک لوٹ کر کنگال کردیا ہے، یہاں پر ہرسال کروڑوں لوگوں کو قحط سے مرتے ہوئے حکومت بے رُخی کے ساتھ دیکھتی رہتی ہے‘(انقلاب 1857، پی سی جوشی، ص 321)

ملک کی اس قدر بدحالی سرسیّد سے دیکھی نہیں جارہی تھی،دل میں ترک وطن کا خیال آیا اور مصر میں سکونت اختیار کرنا چاہی۔لیکن اُنس پرور جذبے اور وطن کی محبت نے ان کے دل سے صدائے احتجاج بلند کیا کہ

’نہایت نامردی اور بے مروّتی ہے کہ قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں جاگزاریں ۔اس مصیبت میں شریک رہنا، اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے،مصیبت میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔‘(حیات جاوید۔حالی صفحہ 88)

ملک کی فلاکت وغربت کو دور کرنے کے لئے سرسیّد نے عہد حاضر کی تعلیم پر حتی الامکان زور دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک تباہی کی سب سے بڑی وجہ تعلیم سے دوری ہی تھی۔قدیم تعلیم میں بیکاری کی نمو نظر آرہی تھی،اس تعلیم میں آہ واہ میں مبتلا رکھنے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا جبکہ جدید تعلیم ترقی کے نئے نئے در کھول رہی تھی اس لئے سرسیّد نے جدید

تعلیم یعنی تعلیم نو پر زور دیا۔ سرسید کے اس نظریے کو حالیؔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

'ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی ہندوستان کی بھلائی کی تمام تدبیریں بے کار اور فضول ہیں۔

(حیات جاوید۔ حالیؔ۔ صفحہ 132)

سرسید، سائنس اور ٹیکنالوجی کی معلومات کے بغیر ملک کی غریبی دور کرنے کی تمام کوششیں رائیگاں سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے انھوں نے 'سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی اور سائنس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ ملک ہندوستان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے، اور اسے توانائی بخشنے کے لئے انھوں نے ایک جنون کی لے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ دلّی کا اپنا موروثی مکان تک فروخت کرکے رقم جمع کی، گورنمنٹ سے لون لئے اور انگلینڈ گئے، وہاں رہ کر وہاں کے ملکی نظام اور سائنسی ترقی کو بغور دیکھا سمجھا۔ دیگر ترقی یافتہ ملک کے دورے کئے۔ واپس آکر اپنے ملک کی ترقی کے لئے چندے مانگے، لیکچرز دے دے کر قوم کو بیدار کیا۔ نمونے کے طور پر نئی تعلیم کی علی گڈھ میں یونیورسٹی قائم کی۔ نئی تہذیب، نئی روشنی کے لئے 'تہذیب الاخلاق' نام کا رسالہ نکالا، اس رسالے نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کا کام کیا اور توانائی بخشی۔

یہ سرسید کی رہبری کا ثمرہ ہے جس سے تمام ہندوستانی قوم بیدار ہوکر ترقی کے منازل پر گامزن ہوئی۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ہندوستان کی دو آنکھیں مانتے تھے کیونکہ وہ اتحاد کے زبردست حامی تھے۔

'میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو یہ بھینگی ہو جائیں گی اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے تو یہ کانی ہو جائیں گی۔' (حیات جاوید۔ حالیؔ۔ صفحہ 8)

اس طرح رہبر قوم وملت سرسید نے دور انحطاط کو دور انقلاب میں بدل دیا اور سوئی ہوئی قوم کو علوم جدیدہ کی جانب راغب کرکے ترقی کی راہ ہموار کی۔ ملک ہند میں تعلیم نو کی روشنی پھیلانے والا یہ سورج 27/ مارچ 1898 کو غروب ہو گیا لیکن ترقی کے راستے اور منازل روشن کر گیا۔

2۔ بابائے وطن: مہاتما گاندھی

بابائے وطن مہاتما گاندھی ملک کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھیں فرشتہ خو، اور خدا رسیدہ بزرگ کی سی عزت وعظمت حاصل

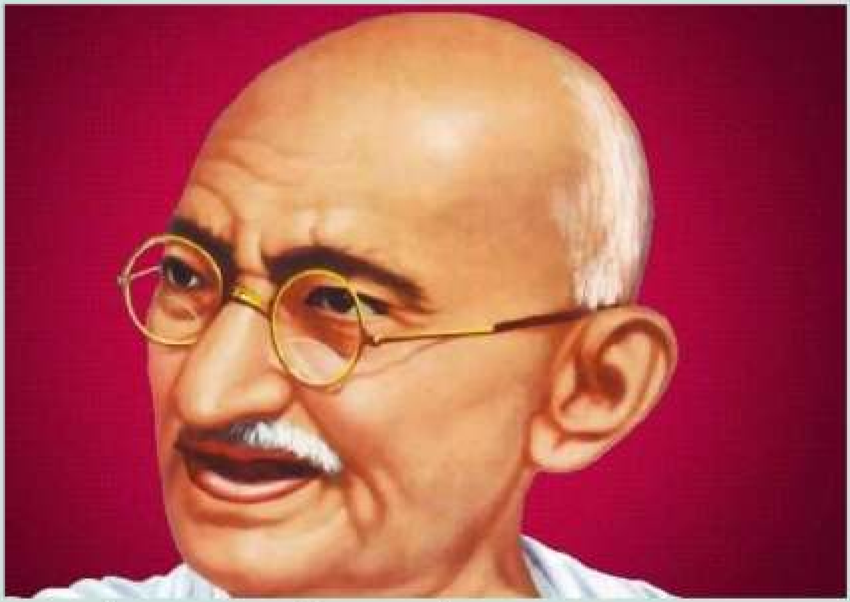

ہے۔ ان کا اصلی نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔ ان کی ولادت 2 اکتوبر 1869 کو گجرات کے پور بندر مقام پر ہوئی۔ جسے سداما پوری بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا ثبوت ان کی خود نوشت سے بھی ملتا ہے۔

''ان ماتا پتا کے یہاں اشون بدی 12 سموت 1925 (یعنی 2/ اکتوبر 1869) کو پور بندر یا سداما پری میں میرا جنم ہوا۔'' (گاندھی کی آتم کتھا۔ صفحہ 28)

مہاتما گاندھی سات برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ راج کوٹ گئے، جہاں دیہاتی پاٹھشالہ میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ مہاتما جی عام قسم کے طالب علم تھے لیکن انھوں نے کبھی نقل اور جھوٹ وغیرہ سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ ایمانداری سے کام کرتے رہے۔ استاد کے اشارے پر بھی نقل سے پرہیز کرتے رہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی خود

نوشت میں کیا ہے کہ

'مجھے لڑکوں سے نقل کرنا کبھی نہ آیا۔ مہاتما جی، بچپن سے ایفائے وعدہ کے پابند رہے۔ ولایت جاتے وقت ماں نے ان سے عہد کرالیا کہ پردیس جا کر مانس اور عورت سے دور رہنا۔ ولایت میں جب ان کے گائیڈ مذمدار نے کہا کہ ولایت میں رہنے والے کے لئے گوشت کھانا اشد ضروری ہے تو انھوں نے ماں سے کئے ہوئے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے اس طرح صاف انکار کردیا کہ 'آپ کی صلاح کے لئے مشکور ہوں لیکن مانس نہ کھانے کا اپنی ماں سے عہد کر چکا ہوں۔ اگر اس کے بغیر گزارا نہ ہوسکا تو میں واپس ہندوستان لوٹ جاؤں گا لیکن گوشت کو ہرگز نہ کھاؤں گا۔'

(گاندھی جی کی آتم کتھا۔ صفحہ 44)

گاندھی جی خوددار منش تھے انھیں کوئی بے عزتی گوارا نہ تھی۔ یہ جب وزیٹر کی حیثیت سے پہلی مرتبہ 'ڈربن' عدالت میں گئے اور انھیں پگڑی اتارنے کا حکم ہوا تو یہ واپس چلے آئے لیکن پگڑی نہ اتاری۔ اس واقعے کے اخبار میں چھپنے سے گاندھی جی کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ گاندھی جی اپنی فرض ادائیگی کے اصول کے پابند رہے، جب وہ دادا عبداللہ کمپنی کی پیروی کو پریٹوریہ جارہے تھے تو انھیں دھکا دے کر مورتسورگ میں اتار دیا گیا، پھر بھی انھوں نے سفر جاری رکھا

'اس خیال سے کہ جو ذلت ہورہی ہے اسے سہتے ہوئے پیر ٹیوریہ پہنچوں اور مقدمے کا کام ختم کرکے دیس چلا جاؤں۔ مقدمے کو ادھورا چھوڑ کر جانا بزدلی ہوگی۔'

(آتم کتھا گاندھی جی صفحہ 126)

دادا عبداللہ کمپنی کے مقدمے کا نمٹارہ کرنے کے بعد گاندھی جی ہندوستان واپس آنا چاہتے تھے لیکن عوام کی گذارش پر ٹھہر گئے اور 1884ء میں نٹال انڈین کانگریس کمیٹی قائم کرکے ہندوستان واپس آئے اور چھ ماہ بعد دادا عبداللہ کی جانب سے بلاوا پر گاندھی جی دوبارہ اپنے بچوں کے ساتھ افریقہ آئے لیکن انگریز لڑکوں نے اینٹ، پتھروں سڑے انڈوں اور جوتے چپلوں سے آپ اور آپ کے اہل وعیال کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ آپ کے ساتھی لاٹن کی اطلاع پر پولیس سپر ٹنڈینٹ نے رات بھر پولیس ہیڈ کوارٹر میں رکھ کر آپ کی جان بچائی۔

گاندھی جی میں گورمنٹ سے وفاداری کا جذبہ کم نہ تھا (1897-99) تک بور (Boarwar) جنگ شروع ہوجاتی ہے اس دوران گاندھی جی برٹش زخمی سپاہیوں کو 25.26 میل تک ڈولیوں میں لاد کر لانا، ان کی مرہم پٹی کرنا اور انھیں اسپتال تک پہنچانے کا کام اپنے گیارہ ہندوستانی خدمت گاروں کے ساتھ کرتے رہے۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد جنگ کا خاتمہ ہوا اور گاندھی جی کا وفاشعاری کے باعث عزت وقار دوبالا ہوا۔ اور عیال میں گاندھی جی کی قدردانی بڑھ گئی۔ جب وہ ہندوستان آنے لگے تو انھوں نے ان کی عزت افزائی پروگرام منعقد کیا، جس میں انھوں نے سونے، چاندی کے گہنے، ہیرے جواہرات اور قیمتی تحائف کی آپ پر برسات کی۔ لیکن گاندھی جی نے ان قیمتی دولت کے انبار کو گھر لے جانا پسند نہ کیا بلکہ عیال والوں کا ایک ٹرسٹ بنا کر اس ٹرسٹ کو ہی سونپ دیا تاکہ مصیبت کے وقت ان کے کام آئے۔ اس ٹرسٹ نے بینک کھاتے میں یہ دولت جمع کروا کران سے عیالیوں کی خدمت کا حلف لے لیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو دولت کی لالچ وحرص وطمع چھو تک نہ گئی تھی۔ بلکہ خدمت خلق کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ ہندوستانی مزدوروں کے مسائل کے حل کے لئے ان کی آواز عوام اور حکام تک پہنچانے کے لئے "انڈین اوپنین" نام سے ہفتہ وار اخبار نکالا۔ جس میں حکومت سے ہندوستانی مزدوروں کے مسائل اور انھیں حل کرنے کی اپیلیں نکالتے رہے۔ اسی طرح افریقہ میں 1960 میں ایک ظالمانہ گزٹ پاس ہوا جس کے مطابق ہندوستانی مزدوروں کو 3 پونڈ کا ٹیکس دینا لازمی قرار دیا گیا۔ جس کے خلاف گاندھی جی نے 'ستیہ گرہ آندولن' بھوک ہڑتال اور شانتی مارچ کئے۔ جوان کا پہلا آندولن کہلاتا ہے۔ اس آندولن کے سبب 1916 میں یہ ٹیکس معاف ہوا۔ 'کمیشن کی رپوٹ آتے ہی 'انڈین ریلیف بل پاس ہوا۔ اس بل کے مطابق:

1۔ تین پونڈ کا ٹیکس اٹھالیا گیا۔

2۔ تمام وہ شادیاں جو ہندوستان میں قانونی مانی جاتی تھیں وہ افریقہ میں بھی مانی جائیں۔

3۔ انگوٹھے کے نشان والا پروانہ یونین کے دائرے میں دخول کا اجازت نامہ مانا جائے۔

گوکھلے کے بلانے پر گاندھی جی لندن میں ٹھہرتے ہیں، اسی وقت پہلی جنگ عظیم شروع ہوجاتی ہے۔ وہاں پر گاندھی جی ہندوستانیوں کو ساتھ لیکر زخمی فوجیوں کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ انگریز حکام پر گاندھی جی کی خدمات کا گہرا اثر ہوا اس طرح وہ دل سے گاندھی جی کے قدردان ہو گئے، جنگ ختم ہوتے ہی گاندھی جی بمبئی آئے۔ بمبئی پہنچتے ہی بمبئی کے گورنر کا بلاوا آیا۔ دیکھئے گورنر کے جملے' آپ کو آندولن کرنا ہو تو

پہلے مجھ سے مل لیا کریں، آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ سرکار جان بوجھ کر کوئی برائی نہیں کرنا چاہتی'
(گاندھی کی آتم کتھا۔ صفحہ 136-135)

گاندھی جی نے گوکھلے سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ میں آشرم بنا کر بھارت میں رہنا اور ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ گوکھلے نے گاندھی جی کی درخواست منظور کرتے ہوئے پیسوں کے بندوبست کا وعدہ کیا۔ گاندھی جی نے احمد آباد میں آشرم کے لئے جگہ منتخب کی اور گوکھلے ٹرسٹ سے 25 مئی 1917 کو گاندھی جی سیوا آشرم احمد آباد میں قائم ہوا۔

بہار کے کسانوں پر نیل کی کھیتی کا ظالمانہ قانون تھا۔ یعنی 3.20 کٹھا کے طور پر زمین پر کاشت ہوتی تھی۔ مطلب 20 کٹھا کھیت میں 3 کٹھا نیل کی کھیتی لازمی تھی جو نیلھوں کے لئے ہوتی۔ اس کو نیل کا داغ کہا جاتا تھا۔ یہ 100 سال پرانہ قانون لاگو تھا۔ بنگال کے گونر کے پاس گاندھی جی نے اس کا معاملہ اٹھایا۔ اس کی جانچ کمیٹی بنی، پھر رپوٹ آئی جس کے ممبر گاندھی جی بھی تھے۔ رپوٹ پر عمل کرتے ہوئے بنگال کے گونر نے اس استحصالی قانون کو ہٹالیا۔

اس طرح گاندھی جی نے بغیر خون خرابہ کے، بغیر کسی ہتھیار کے حق وصداقت پر قائم ودائم رہ کر ہر ظالمانہ روش کا خاتمہ کیا، اور ملک کو آزاد کرایا جو ایک بہت بڑا عجوبہ کارنامہ ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے۔ جن کی شان میں شاعر یوں کہتا ہے۔

لے لی آزادی بنا کھڈگ، بنا ڈھال
سابرمتی کے سنت تونے کردیا کمال

ملک کی اور انسانیت کی بے لوث خدمت کرنے والے اس سنت کو ان کے ہی آشرم کے ایک ظالم شاگرد نے 30 رجنوری سن 1948 کو گولی مار کر شہید کردیا۔

3۔ فخر ہندوستان: اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام

صدہا برسوں کی غلامی سے ہمارا پیارا وطن ابھی آزاد ہی ہوا تھا کہ پڑوسی ممالک نے پیہم حملوں کی جھڑی لگادی۔ پاکستان وچین کے پیہم حملوں نے ہندوستان کی کمر توڑ دی۔ چین نے تو تبت اور ہندوستان کا کچھ حصّہ بھی قبضہ کرلیا۔ مغربی ممالک بھی ہند کو حقیر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی مشکل گھڑی میں ہندوستان کی دفاعی طاقت بڑھانا لازمی ہوجاتا ہے۔ فضل ربّی سے 15راکتوبر 1931 کو رامیشورم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی محنت اور انتھک کاوشوں سے ہندوستان بھی دیگر طاقتور ممالک سے آنکھ ملانے کے قابل بنا۔ جسے ہم فخر ہندوستان۔ ڈاکٹر اے پی۔ جے عبدالکلام کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کا پورا نام ابو الپاکر زین العابدین عبدالکلام ہے۔ یہ ایک نہایت غریب خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کی بہن نے اپنے گہنے گروی رکھ کر ان کا داخلہ کرایا۔ انھوں نے اخبارات بیچ کر اور وظائف کی رقم سے اپنی تعلیم پوری کی، نتیجتاً جب ملک کے صدر منتخب ہوئے تو اپنے سیکریٹری سے کہتے ہیں۔

'میں راشٹرپتی بھون کو عوامی مقام بنانا چاہتا ہوں، جہاں دبے کچلے لوگوں کی آواز سنی جائے۔ اور اس پر کارروائی ہو۔' (اے پی جے عبدالکلام۔ ایم۔ پی کمل صفحہ 18)

بچپن میں کلام سمندر کے کنارے جاتے، اس کی لہروں کو دیکھتے، لہروں کے اوپر اُڑتے سارس کی قطاروں کو دیکھا کرتے اور کہتے ایک دن میں بھی ان چڑیوں کی طرح آسمان میں اُڑان بھروں گا۔ ان کی شخصیت میں بچپن سے ہی کشش کی نمو پائی جاتی رہی ہے، جنھیں دیکھ کر لوگ ان کی خود بخود قدر کرنے لگتے، ایک مرتبہ ان کے استاد کی بیوی نے انھیں باہر کچھ کھاتے ہوئے دیکھا تو ان سے اتنا مانوس ہوئیں کہ انھیں اپنے کچن میں کھانا دیا اور بولیں

'اب کھاؤ۔ تم میرے بیٹے جیسے ہو، اور میں تمھاری ماں کی مانند ہوں۔' (اے پی جے عبدالکلام۔ ایم۔ پی کمل صفحہ 32)

پرائمری کی تعلیم پوری کرنے کے بعد کلام، رام ناتھ پرُم، جاتے ہیں ماں انھیں دعائیں دیتی ہے۔

'جا بیٹا میری ساری دعائیں تیرے ساتھ ہیں، تو ایک دن اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔'

(A.P.J عبدالکلام۔ M.P کمل صفحہ 37)

1950 میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کر ترچنا پری سنٹ جوسف کالج میں داخلہ لیا اور دل وجان سے تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے، انٹر و بی۔ ایس۔ سی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد اپنے بچپن کی تمنا کہ 'سارس کی طرح ہم بھی ایک دن ہوا میں پرواز کریں گے' پوری کرنے کے لئے ایرو انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا۔ جس کے لئے بہن نے اپنے زیور گروی رکھی، ہاسٹل اور پڑھائی کا خرچ محنت کر کے وظیفہ کے پیسے سے پورا کرتے رہے اس طرح بڑی جانفشانی سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی لگن اور محنت سے ان کے تمام اساتذہ خوش رہتے تھے۔ میتھ کے استاد، نرسنگ راؤ، کا کہنا تھا۔

'عبدالکلام جیسے شاگرد بڑی مشکل سے اس دھرتی پر جنم

لیتے ہیں اور بڑے بھاگیہ سے انھیں پڑھانے کا موقع ملتا ہے۔' (اے پی جے عبدالکلام۔ایم پی کمل صفحہ 54)

27/سال کی عمر میں کلام 1958 میں جہاز رانی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اسی وقت دہلی اور دہرادون میں نوکری کی جگہیں نکلی،انھوں نے دونوں جگہ کا فارم فل کیا اور کانپور میں ایک سال کی ٹریننگ پر بھیج دئے گئے۔وہاں پر انھوں نے ایک سال تک کڑی محنت کی پھر دلّی گئے 2سال گذارنے کے بعد بنگلور ہوائی جہاز بنانے کے

کارخانے میں بھیجے گئے وہاں پر ایک بڑی سخت محنت کے باعث اپنے ساتھی انجینئر گولے کے ساتھ اپنے سے تیار کردہ ہوائی جہاز 'نندی' سے اُڑان بھری۔اس طرح 1962 میں انھوں نے اپنے بچپن کا خواب پورا کر دکھایا۔

نئے وزیر دفاع نے راکٹ انجینئر بنا کر بمبئی روانہ کیا جہاں انھوں نے راکٹ ٹیکنک کو سمجھا،اس کی باریکیوں پر غور کرنے کے بعد 21نومبر 1963 کو ناسا سے 'ناتک اپاچی' کا کامیاب ٹیسٹ کیا۔اس کے بعد۔امریکہ،جرمنی،جاپان کے سائنس دانوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے۔'روہنی راکیٹ' کا ٹیسٹ کیا۔'موٹر توپوں' پر کام کرتے ہوئے 18/اکتوبر 1972 کو سودیسی راٹو موٹر توپ' کا ٹیسٹ بھی کیا۔روہنی اسپنک کی کامیاب اُڑان کرائی۔26/جنوری 1981 میں انھیں 'پدم بھوشن' کے انعام سے نوازا گیا۔اسی عرصہ میں انا یونیورسٹی مدراس نے انھیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔1982 میں ڈاکٹر کلام D.R.D.N کے ڈائرکٹر ہوئے۔انھوں نے غالباً 280 انجینئروں اور عظیم سائنس دانوں سے عہد لیا کہ

'مغربی ممالک کے پاس جیسی تکنیکی طاقت ہے۔ہم اپنے ملک کو بھی ایسی جدید تکنیکی طاقت دلائیں گے۔اور اس سے ہم اپنے ملک کے سینانیوں کے لئے جدید تکنیکی ہتھیار کا ایجاد کریں گے۔جس سے ہمارا ملک اپنی حفاظت کے لئے خود کفیل بن سکے۔'

(اے پی جے عبدالکلام۔ایم پی کمل صفحہ 121.122)

یہی نہیں 1974 میں ہومیو جہانگیر بھابھا کے ساتھ خفیہ کا کام کرتے ہوئے ایٹم بم پر بھی کام کیا اور پوکھرن (جیسلمیر) میں ایٹمی ٹیسٹ کرکے ثابت کردیا کہ ہندوستان بھی ایٹمی طاقت سے بھرپور ملک ہے۔یعنی انھوں نے اپنا یہ عہد بھی پورا کرکے دکھایا کہ

'دنیا چاہے کتنا ہی زور لگالے ہم بھارت کو ایٹمی مہاشکتی بنا کر رہیں گے۔'

(اے پی جے عبدالکلام۔ایم پی کمل صفحہ 152)

ڈاکٹر کلام کی مدد سے ہندوستان نے پوکھرن میں دوسرا ایٹمی ٹیسٹ کردنیا کو چونکا دیا۔25 جولائی 2002 کو کلام ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے اور 27 جولائی 2015 کو بچوں کے درمیان لکچر دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔اس طرح اس عظیم شخص کی پوری زندگی ملک کی خدمت میں گذری۔

آخر میں ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ماہ آب کے ان سرفراز ستاروں نے سیاسی،سماجی ، دفاعی اور اقتصادی استحصال سے نجات دلائی اور ملک کی شان بلند کی ایسے بے لوث خدمت گاروں اور ملک کے جانثاروں کو صدہا سلام۔

□□□

Dr. Tasneem Bano
C/o. Firdaus Akhter
R/o 63/44 Colonelganj
Allahabad-211002 (U.P)

شگفتہ یاسمین

نذر سجاد حیدر کے ناول

اختر النساء بیگم کا تنقیدی جائزہ

نذر سجاد حیدر یلدرم (نذر زہرا بیگم) ایک آزاد خیال اور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے والد میر نذر الباقر قدیم رسم ورواج کے قائل نہیں تھے انھوں نے نئے دور کی روشن خیالی کو قبول کیا اور اسی طرز پر اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی نذر زہرا بیگم نے ایک یوریشین میم سے تعلیم حاصل کی اور معاشرتی اصلاح کے تحت رسالہ "تہذیب نسواں" میں مس نذر الباقر کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ بدعتوں، قبر پرستی اور تعزیہ پرستی کے خلاف مضامین لکھے۔ان اصلاحی اور ترقی پسند خیالات کے تحت مختلف رسائل (خاتون، عصمت) میں لکھنا شروع کیا۔1909 میں مولوی سید ممتاز علی نے ہفتہ وار اخبار "پھول" کا اعزازی مدیر مقرر کیا۔ اصلاح معاشرت کے ضمن میں انھوں نے قصہ وکہانی کو بھی اپنے افکار ونظریات کے اظہار کا وسیلہ بنایا انھوں نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کی تحریکات کی نمائندگی کی۔اور اپنے افسانوں، ناولوں کے ذریعے جدید تعلیم اور تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ان کے ناولوں میں "اختر النساء بیگم (1910)، آہ مظلوماں (1914)، ثریا (1930)، جاں باز (1935)، حرماں نصیب (1938) اور نجمہ (1939) وغیرہ اہم ہیں۔

اختر النساء بیگم:

"اختر النساء بیگم" نذر سجاد حیدر کا پہلا اصلاحی ومعاشرتی ناول ہے۔جس کا موضوع تعلیم نسواں کی تبلیغ واشاعت ہے۔اس کا مقصد عمدہ تعلیم وتربیت کے مفید نتائج کو بیان کرنا ہے تاکہ اپنی قوم کو ترقی وکامیابی کی راہ دکھائی جاسکے۔یہ ناول پہلے قسط وار "تہذیب نسواں" میں شائع ہوا بعد میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے 1911 میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔نذر سجاد قصہ کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے مستورات کی بدحالی اور ان کے عیوب کا تذکرہ کرتی ہیں:

"یہ سب خرابیاں صرف جہالت کی وجہ سے ہیں۔۔۔۔لیکن جہالت قصور مستورات کا نہیں۔یہ ان کی قسمت کے مالکوں بلکہ قوم کی غفلت کا نتیجہ ہے۔کہ وہ تعلیم نسواں کو اپنے حقیقی فرائض میں شمار نہیں کرتے اور اس کے لیے عام کوشش نہیں کرتے۔۔یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم نے ابھی تک کوئی ترقی نہیں کی۔جن اقوام میں تعلیم نسواں کا رواج ہے۔وہ اعلیٰ معراج ترقی پر پہنچ چکی ہیں۔۔خدا کا لاکھ شکر ہے کہ تہذیب نسواں کی زبردست چیخ پکار سے یہ غفلت شعار قوم بھی بیدار ہو چکی ہے۔۔۔اگر اللہ کو ہماری بہتری منظور ہے تو سب راہ راست پر آجائیں گے۔کیونکہ علم کے فوائد پوشیدہ نہیں۔"

(نذر سجاد حیدر: اختر النساء بیگم (مرتبہ) قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2004 ص 4)

اختر النساء اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے والد مسٹر رفیق احمد بی۔اے نہایت آزاد خیال جنٹلمین ہیں۔ان کی بیوی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، جدت پسند خاتون ہے۔ جو ہندوستانی معاشرت کے برعکس نئے طرز حیات کے مطابق زندگی بسر کرتی ہیں۔اس لیے کہ وہ زمانہ شناس اور روشن خیال مولوی محمد یونس کی تربیت یافتہ ہیں۔لیکن ان کی ناگہانی موت کے بعد وکیل صاحب نے اختر النساء کو گرلز اسکول کانپور داخل کرادیا اور احباب کے اصرار پر جانی بیگم سے عقد ثانی کرلیا۔یہ بیوی جاہل، ضدی، کج خلق، بدسلیقہ، مکار اور جعل ساز عورت تھی۔جو مغربی طور طریق کے خلاف اور مشرقی معاشرت وعقائد کی پابند ہے۔لہذا اس نے اپنی مشرقی

طرزِ حیات کے مطابق وکیل صاحب کی زندگی اور ان کے گھر میں تبدیلی کی ۔ جانی بیگم کی تربیت یافتہ لاڈلی بیگم جاہل، غیر تربیت یافتہ، بدمزاج اور ضدی لڑکی ہے۔ جو اپنی جہالت اور بدمزاجی کے سبب برے انجام کو پہنچتی ہے۔ اس کے برعکس اختر النساء نہایت صابر، تعلیم یافتہ، ہنرمند، معاملہ فہم اور دور اندیش ہے جو جاہل اور غریب گھرانے میں شادی کے بعد مختلف مسائل سے دوچار ہوتی ہے لیکن وہ اپنے ہنر و سلیقہ سے معاملات کو حل کرتی ہے ۔ شوہر کی موت کے بعد درماندگی کی زندگی بسر کرتی ہے بالآخر ان حالات سے نجات کے لیے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے اور اپنی عمدہ تعلیم کے سبب ترقی کر کے اسکول انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوتی ہے اور خواتین کی تعلیم و اصلاح کے ذریعے قومی خدمات انجام دیتی ہے۔ طوائف زادی جانی بیگم اپنے راز کے افشا ہو جانے پر گھر کا تمام قیمتی اثاثہ لے کر اپنی خادماؤں کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ اور وکیل صاحب افسوس و ملامت کرتے رہ جاتے ہیں۔ اس خاندان کے مقابل اختر النساء کی خالہ مسز رفیق اور ان کے شوہر نہایت مہذب اور روشن خیال افراد ہیں یہ خاندان جدت پسند اور لغو رسومات کے خلاف ہے۔ عمدہ تعلیم و تربیت کے سبب یہ ترقی یافتہ اور کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔

اختر النساء بیگم ایک تعلیمی و اصلاحی ناول ہے نذر سجاد نے اس قصہ کے ذریعے برطانوی ہندوستان میں تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت بیان کی ۔ اور اس سے نئے نظام حیات سے مطابقت و ہم آہنگی کے لیے خواتین کو تیار کیا ۔ اس لیے کہ سرسید تحریک کے ذریعے مردوں کے تعلیم کے بہتر مواقع حاصل ہو چکے تھے لیکن خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی لہذا اس رفقائے سرسید کی اتباع میں اس دور کے اصلاح پسند اور ترقی کے خواہش مند طبقے نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی کوشش کی ۔ اسی نقطہ نظر کے تحت نذر سجاد نیا اختر النساء بیگم کا مثالی قصہ پیش کیا۔ اس کے متعلق قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

> ’’امی نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اصلاحی ناول لکھا، جس کی ہیروئن اختر النساء بیگم نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقلمندی سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔۔۔۔ امی کے یہ سارے ناول ان کے طبقے کے اس پس منظر کی بہت عمدہ عکاسی کرتے تھے جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اوپری طبقے کی طرح یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کردی تھی۔‘‘ (قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے۔

(قرۃ العین حیدر، سفینۂ غمِ دل، نسیم بک ڈپو لکھنو 1955، ص 36-37)

اختر النساء نذر سجاد حیدر کا آئیڈیل کردار ہے جو ان تمام صفات سے متصف ہے جو وہ اس زمانے کی خواتین میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ وہ مسلم خواتین کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس لیے کہ برطانوی نظام میں اب یہی علوم ترقی و کامیابی کا خزینہ تھے لہٰذا انھوں ان علوم کے حصول اور مغربی معاشرت سے اختلاط کو ضروری قرار دیا۔ اس مقصد کے تحت نذر سجاد نے ناول میں دو مختلف نظریات کے حامل طبقوں کو پیش کیا ایک طبقہ مغربیت کا دلدادہ ہے جس کا طریق حیات نوآبادیاتی حاکموں کے مطابق ہے مثلاً مکان، لباس، رہائش، کھانے پینے کے اوقات و آداب، کھیل کود، سلام و کلام، گراموفون اور پیانو بجانا وغیرہ۔ یہ طبقہ ہندوستانیوں کے مقابل انگریزوں سے ربط ضبط رکھتا ہے۔ اور مشرقی نظام حیات سے متنفر ہے۔ اور اس طرز معاشرت کی اصلاح کا خواہشمند ہے۔ اس کے برعکس دوسرا طبقہ انگریزی طرزِ حیات کے خلاف ہے اسے اپنی روایتیں عزیز ہیں اور اس میں وہ اصلاح و ترمیم کا خواہشمند نہیں۔ لہذا اسے غیر ترقی یافتہ اور روایت پسند قرار دیا گیا اور اس کے عیب و نقائص کی نشاندہی کی گئی۔ کہ یہ طبقہ جاہل، ریاکار، مکار اور غیر مہذب ہے اور یہ لغو رسومات اور غیر عقلی نظام حیات کی دین ہے۔ نذر سجاد حیدر اس کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’یہی رسومات ہیں جنھوں نے ہماری قوم کو تباہ و برباد کر ڈالا ۔ علاوہ نقصان مالی کے بعض رسومات ہمیں مشرک و ناشائستہ بناتی ہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو تباہ کرنا کون پسند کرے گا۔‘‘

(نذر سجاد حیدر: اختر النساء بیگم، قرۃ العین حیدر (مرتبہ)، اختر النساء بیگم، ص 78)

نذر سجاد نے اس ناول کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا کام انجام دیا اور اس میں ان رسومات و توہمات کو بیان کیا جس کی وجہ سے ہندوستانی معاشرہ جمود و زوال کا شکار تھا۔ مصنفہ ان رسومات کا تنقیدی جائزہ لیتی ہیں جو مشرقی معاشرت کا حصہ تسلیم کی جاتی ہیں، شادی و بیاہ یا بچہ کی ولادت پر بے ہودہ گیت گائے جاتے ہیں اور خلاف تہذیب لغو رسومات عمل میں آتی ہیں وہ ایک رسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’دلہن کے جوتے سمیت پیر دولہا کے سر سے لگا کر جوتی چھوائی گئی ۔ یہ اس لیے کہ میاں ہمیشہ جوتی کے نیچے (رہے) پھر دلہن کو سرہانے کی طرف دولہا کے مقابل بٹھا دیا۔‘‘

(ایضاً، ص 114)

اسی طرح اس معاشرے کا یہ عیب قرار دیا گیا کہ یہاں شادی میں لڑکیوں کی رضامندی کو دخل نہیں، پردہ کی پابندی اور جدید نظام حیات سے بےزاری اور بے جا تعصب پایا جاتا ہے اصلاح پسندی کے ضمن میں نذر سجاد ان عیوب کو مشرقی معاشرت کا حصہ بتاتی ہیں کہ شادی میں لڑکیوں کو آزادی رائے کا حاصل نہ ہونا بزرگوں کی سراسر حماقت ہے اور ان پر ظلم ہے ،وہ پردہ نسواں کی بھی مخالفت کرتی ہیں اور انگریزی علاج یا مغربی طرز بودوباش اختیار نہ کرنے کو اس قوم کا تعصب بتاتی ہیں اور اسے توہم پرستی اور بدعقیدگی کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کسی معاشرے کے چند افراد کے طریق حیات سے اس نظام کو کلیتاً کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مصنفہ اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ مذہب اسلام عورت کو شادی و بیاہ، میں آزادی رائے کا حق دیتا ہے اسی طرح پردہ کو عورت کی عزت وتوقیر کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان تعلیمات سے واقف ہونے کے باوجود وہ اس کی مخالفت کرتی ہیں اس لیے کہ وہ مغرب سے متاثر و مرعوب ہیں اور اپنی قوم کی ترقی و کامیابی کے لیے اس سے مطابقت اور آہنگی کی خواہاں ہیں لہٰذا وہ مغرب کے مقلد طبقے کی ترقی پسند خیالات اختر النساء کی زبانی پیش کرتی ہیں کہ انھوں نے خواتین کو آزادی رائے کا حق دیا لکھتی ہیں:

”یہ آپ کی زمانہ شناسی اور دوراندیشی اور اس بے بس و بے زبان فرقے کے حال پر کمال مہربانی ہے کہ اپنا ہر طرح کا اطمینان اور سوچ بچار اور پسند کر لینے پر بھی ان کم عمر کم سمجھ بیچاریوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی تمام عمر کے ان معاملات کا تعلق ہے۔“ (ایضاً،ص46)

یہ انقلابی خیالات اس لیے پیش کیے گئے کہ انگریزوں کے یہاں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا باہم ملنا، گھومنا پھرنا اور ساتھ ساتھ رہنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لہٰذا یہ اصلاح پسند لوگ اسی کی اتباع میں اپنے معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس طرح وہ پردے کے بھی قائل نہیں۔ مسز وقار کہتے ہیں:

”منگنی کے بعد قریبی رشتے داروں سے پردہ ہو جانا بھی برا سمجھتا ہوں اور نجم کی ساس تو میری حقیقی بہن ہے اور اس کا بیٹا میرا بھانجا۔ کنبے برداری کے برا کہنے کی پرواہ نہ کر کے میں نے نجم کو کسی سے پردہ نہیں کرایا۔۔۔۔ اور میں تو تجمل حسن کو بھی اپنے گھر میں کھلے ڈوبے آنے دیتا ہوں۔“

(ایضاً،ص46)

یہ شادی و بیاہ میں نئے طور طریقے اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہیں اس لیے کہ جاہل مائیں اپنی بدسلیقگی اور بے جا رسومات کی پابندی کے سبب شادی و بیاہ کو سخت مصیبت بنادیتی ہیں۔ نذر سجاد کے مطابق اس کا علاج ”تعلیم نسواں“ ہے لہٰذا اس تعلیم و معاشرتی نظام سے منسلک ہونے کی وجہ سے مسز وقار بقول ناول نگار

”ایک تعلیم یافتہ بی بی نے اپنے شوہر کو کس قدر زحمت سے بچایا۔“ (ایضاً،ص74)

ان روشن خیال افراد نے رسومات قبیحہ پر اعتراض کیا اور ناچ گانے، آتش بازی، باجے گاجے وغیرہ فضول رسومات قدیمہ کی قباحتیں بیان کیں اور شادی و تقریبات کے اخراجات کی کل رقم کو اصلاحی و تعلیمی اداروں کے لیے وقف کردیا۔ اور نوشہ کے اس عمل کو بیدار مغزی، قومی ہمدردی اور اصلاح پسند طبیعت کا اثر بتایا گیا۔ اور قوم کی ترقی و کامیابی کے لیے ان رسومات کو ترک کرنے کا عہدو پیمان لیا گیا اس لیے کہ:

”یہ رسومات بربادی بخش و تباہ کن ہیں اور انھیں جھوٹی شیخیوں نے ہمیں اس حالت کو پہنچایا کہ وہ بیوہ عورت جس کی آمدنی کا کوئی سہارا نہیں ہوتا اور لڑکی کی شادی کرتی ہے۔ تو یہی چاہتی ہے کہ تمام دنیا کی رسومات ختم کردوں۔ کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔۔ خواہ گھر تک رہن رہ جائے اور غریبوں پر ہی کیا منحصر ہے بڑے بڑے امیروں اور نوابوں کے خزانے لٹ گئے۔ وہ انھیں رسومات قبیحہ کی پابندیوں سے ٹکڑوں کو محتاج ہوگئے۔ میری سمجھدار بہنوں۔۔ اہل عقل کے نزدیک یہ کب درست ہوسکتا کہ کسی امر کو مضر سمجھیں اور پھر اس کو روا رکھیں؟ پس انھیں وجوہات پر ہم نے ضروری سمجھا کہ جس قدر ممکن ہوسکے۔ اس بربادی قوم کی جڑ کو بالکل کاٹیں کیوں کہ یہ کام ہمارے ہی کرنے سے ہوگا۔“

(ایضاً،ص83)

جہیز ایک سماجی لعنت ہے اور جس کا شکار بہت سی لڑکیاں ہوئیں حسب خواہش جہیز نہ دیئے جانے پر ان کو طرح طرح سے زدوکوب کیا گیا۔ یہ اصلاح پسند طبقہ شادی و بیاہ میں ہونے والی رسومات کو لغو اور خلاف تہذیب بتاتا ہے لیکن وہ جہیز کی مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کفایت شعاری اور ضرورت زمانہ کے تحت جہیز بنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس کے متعلق مسز ضیاء الحسن (ناول کا کردار) اپنی بھتیجی کی شادی میں یہ تقریر کرتی ہیں:

"میرے بھائی جان نے اپنی دونوں لڑکیوں کے نام دس دس ہزار روپیہ جمع کر رکھا تھا اور ان کی یہی رائے تھی کہ جس دن لڑکی کی شادی ہو۔ اسے دس ہزار کی پاس بک دے دی جائے گی۔۔۔۔ آپ جانتی ہیں کہ زمانہ بدل گیا اور زمانہ گذشتہ اور حال کی ضرورت میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ پس لڑکی کے جہیز میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے، چونکہ یہاں کی بھی انگریزی طرز معاشرت ہے اور جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے وہ بھی انگریزی طریقہ سے بسر کر رہا ہے۔ اس لیے وہی سامان دینا چاہیے تھا جو ان کے کام آسکے۔" (ایضاً، ص84)

ابتدائی ناول نگاروں کے طرز پر نذر سجاد نے موضوع "تعلیم نسواں" ہی کا انتخاب کیا اور مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے جدید تعلیم کی ضرورت و اہمیت بیان کی تا کہ وہ دونوں کولونیل نظام کے مطابق کامیاب اور ترقی یافتہ زندگی کے حصول میں ایک دوسرے کے معاون ہوں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دونوں تعلیم یافتہ اور ضرورت زمانہ سے باخبر ہوں اس لیے کہ جاہل میاں اور تعلیم یافتہ بیوی میں نہیں نبھ سکتی۔ اختر النساء اس نئی عورت کی نمائندگی کرتی ہے لہٰذا اس کا شوہر اپنی مثالی بیوی کی خوبیوں اور لیاقتوں کا اعتراف کرتا ہے کہ

"آپ کو خدا نے دنیا میں ایک بنایا ہے۔ ایسا جفاکش بھی کوئی نہ ہوگا۔ ایثار نفسی آپ پر ختم ہے۔" (ایضاً، ص149)

اختر النساء، نذر سجاد کی آئیڈیل کردار ہے جو روشن خیال اور جدت پسند طبقے کی پروردہ ہے وہ دور اندیش اور معاملہ فہم ہے۔ وہ اپنی جاہل اور توہم پرست سسرال میں نہایت مصیبت و ذلت برداشت کرتی ہے لیکن وہ اپنے حوصلہ اور حسن سلیقہ سے ان تمام دشوار اور پریشان کن مراحل کو طے کر لیتی ہے۔ اسی طرح اپنے کورے، جاہل اور غیر تربیت یافتہ شوہر کی اصلاح و تہذیب کرتی ہے۔ ایام بیوگی میں سسرال سے نکال دیئے جانے پر وہ در بدر کی ٹھوکریں نہیں کھاتی بلکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے ، نام بدل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ناول نگار نے اس کے ذریعے ہندوستانی معاشرے میں بیواؤں کی افسوس ناک حالت بیان کی وہیں اس کی تعلیمی جدوجہد کو پیش کیا تا کہ اس کے طرز پر خواتین اپنی زندگی کو با مقصد بنائیں۔ نذر سجاد اختر النساء کی علمی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس دور میں خواتین کی تعلیمی صورت حال کا بیان کرتی ہیں:

"میں نے اپنا نام بدلا تھا کہ اختر النساء مشہور ہو جانے سے سب پہچان لیں گے کہ میں ہندوستانی مسلمان لڑکی ہوں اور مجھے یہ بات اس لیے ناپسند تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا آزادانہ طریق سے تعلیم پانا ہماری قوم کی نظروں میں کھٹکے گا اور معیوب سمجھ کر عوام کی نظریں مجھ پر پڑیں گی اور میں تماشا بن جاؤں گی۔ لوگ ہزاروں باتیں بنائیں گے اور تو علیحدہ رہے۔ قومی اخبارات ہی لعن طعن کر کے کچھ کا کچھ لکھیں گے۔ اس خیال سے بجائے اختر کے ستارا نام ظاہر کیا کہ پارسی لڑکی سمجھ کر کسی کو حرف گیری کا موقع نہ ملے گا۔"

(ایضاً، ص221)

نذر سجاد اس تعلیم کی خیر و برکات کو بیان کرتی ہیں کہ شریف اور تعلیم یافتہ خواتین اپنی سوتیلی اولاد سے اچھا سلوک رکھتی ہیں برخلاف رذیل اور جاہل ماؤں کے۔ گویا اس تعلیم سے جہاں آئندہ نسل کی پرورش و پرداخت مدنظر تھی وہیں سائنسی علوم کے ذریعے ممتا یا ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے بیان سے ناول نگار کا مقصود یہ تھا کہ خواتین ان علوم سے فیضیاب ہونے کر کولونیل نظام کے مطابق نو آبادکار کی تربیت و تہذیب کا کام انجام دیں۔

علی گڑھ کالج نے انگریزی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ نذر سجاد اس تعلیمی ادارے کی فضاؤں سے متاثر تھیں وہ اس تعلیم کی برکات و ثمرات کی قائل تھیں لہٰذا اس ادارے کی تعلیم و تربیت کا ذکر خیر کرتے ہوئے وہ ایک کردار کی قلب ماہیت کو پیش کرتی ہیں:

"وکیل صاحب اب میں وہ اقبال بہادر نہ تھا جو منا جان کی لڑکی کی مہربانی سے خوش ہوا کرتا تھا میرے خیال تاس ایک سال میں بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے مجھے کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔ جن باتوں سے میں لکھنؤ میں خوش ہوتا تھا۔ ان کو سوچ کر دل ہی دل میں ذلیل ہوا کرتا تھا۔"

(ایضاً، ص179)

ہندوستان میں برطانوی استعمار نے استحکام و بقا کے لیے تعلیم کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا اور اپنی تہذیب کو اعلیٰ اور ترقی یافتہ قرار دیا اور اس کے مقابل مشرقی تعلیم و تہذیب کو فرسودہ اور غیر ترقی یافتہ بتایا۔ ہندوستانی محکومین نے حاکم قوم کے اس مفروضے کو قبول کیا اور اس کے تحت اپنی اصلاحات کے اصول متعین کیے۔ اس طرح استعماری نظام نے نہ صرف سیاسی اور ارضی غلبہ حاصل کیا بلکہ ان کے ذہن و فکر کو بھی مسخر کر لیا۔ چنانچہ اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کے تحت ادب ، معاشرت اور مذہب کے اصول بنائے گئے کہ وہ عقل و فطرت کے مطابق ہوں۔ لہٰذا تخلیق و ادب کو بھی ان اصولوں پر پرکھا گیا اس ناول میں مغرب

زدہ طبقہ اردو ادب سے بیزار ہے اور مغربی لٹریچر کا مداح ہے۔ ان کے مطابق اردو شاعری میں رکھا ہی کیا ہے لیکن وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے اسی کو وسیلہ اظہار بناتا ہے۔ اردو ادب کے متعلق اختر النساء کے خیالات ملاحظہ ہو:

''نجم میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سوجھتا نہیں۔ غزلیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ لیکن میرے رنجیدہ دل سے حسب حال ہی شعر نکلتے ہیں۔'' (ایضاً،ص48)

غرض نذر سجاد نے ''اختر النساء'' کے مثالی کردار کے ذریعے خواتین کی تعلیمی اصلاح کا کام انجام دیا۔ کہ جس نے مغربی علوم سے استفادہ کیا اور اس تعلیم و تربیت سے ترقی و کامیابی کے مراحل طے کیے۔ موسیقی میں دستگاہ حاصل کی جس سے اس کی آئندہ اعلیٰ ترقی کی امید تھی اس کے علاوہ اس کی قابل قدر تعلیم کے سبب نہایت عزت و قدر کے ساتھ زنانہ نارمل اسکول کی آنریری سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ دیا گیا۔

نذر سجاد نے اس اصلاحی ناول کے آخر میں خطابیہ انداز میں درس دیا ہے اس نوٹ کو اس قصہ کا لب لباب قرار دیا جا سکتا ہے:

''ناظرین یہ ہے تعلیم نسواں کا نتیجہ۔ اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں، کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں اور کس بے بس و بے کس حالت میں ہندوستانی رسم و رواج کا لحاظ رکھ کر کس محنت و کوشش سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس سے خود بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ معزز سرکاری ملازمت ترک کرکے قومی خدمات میں اپنی زندگی وقف کردی۔ اور نہایت قدر و منزلت کی حالت میں عمر بیوگی بسر کی ورنہ ہندوستانی بیواؤں کی قابل رحم حالت سے کون واقف نہیں؟ بڑی بڑی مالدار عورتیں شوہر کے انتقال کے بعد دوسروں کی دست نگر اور سب کی نظروں میں حقیر اور ٹکڑے کی محتاج ہو جاتی ہیں۔ اختر بیچاری تو ایک نہایت مفلس اور نادار شخص کی بیوہ تھی۔ اگر چار حرف نہ پڑھے ہوئے ہوتے تو اس کا بھی نہایت خراب حال ہوتا۔ چرخہ کات کر یا ماماگیری کرکے بسر اوقات کرنا پڑتی مگر چونکہ تعلیم یافتہ تھی کس سے کس درجے کو پہنچ گئی۔''

(ایضاً،227۔228)

□□□

Shagufta Yasmeen
Senior Research Fellow
Department of Urdu,
Aligarh Muslim University,
Aligarh

فرہنگ آصفیہ سے

قزلباش۔ ت۔ اسم مذکر۔ مغلوں کی ایک قوم کا نام جن کا پیشہ سپہ گری ہے۔ سپاہی۔ لشکری۔ یہ لفظ قزل بمعنی سرخ اور باش بمعنی سر سے مرکب ہے۔ کیونکہ اسمٰعیل صفوی بادشاہ ایران نے اپنی فوج کو سرخ ٹوپیاں دی تھیں۔ پس اس وجہ سے سپاہیان ولایت کا یہ نام پڑ گیا۔ اور ان کی قوم بھی جدا ہو گئی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ قزلباش ان قیدیوں کی اولاد میں خیال کئے جاتے ہیں جن کو تیمور لنگ نے شیخ حیدر والیٔ ایران کو دیا تھا چونکہ وہ سرخ ٹوپیاں جو ترکوں کی امتیاز کا نشان تھا۔ پہنا کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔ یہ لوگ ایرانی فوج کے عمدہ سپاہی مانے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں نادر کے ساتھ یہی قوم آئی تھی۔ اور ٹوپی والوں کے نام سے مشہور ہوئی۔ چنانچہ میر تقی نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

قضا و قدر۔ ع۔ اسم مذکر۔ وہ حکم جو خدا تعالیٰ نے ازل میں کل کائنات کی نسبت لگا دئے ہیں مگر ان دونو میں ذرا سا فرق بھی ہے یعنی قضا تو وہ حکم ہے جو مجموعتہً و مجملاً روز ازل میں تمام کائنات کی نسبت ہو چکا اور قدر وہ حکم ہے جو بعد ہیچ اس حکم ازلی (قضا) کے موافق ہر ایک فرد کی نسبت علیحدہ اور بالتفصیل ہوتا رہتا ہے۔ پس قضا کو آمر (حکم کنندہ) کہنا چاہئے اور قدر کو مامور (حکم کردہ شدہ) مگر بعض حکما اس کے برخلاف قدر کو آمر اور قضا کو مامور بتاتے ہیں۔ اس مسئلے سے بعض سکندر نامے کے اور بعض دیوان نشاط کے اشعار خوب حل ہوتے ہیں

قضیہ۔ ع۔ اسم مذکر۔ (۱) مطلوب۔ طلب کیا گیا۔ خواستہ شدہ (۲) حکم۔ خبر۔ حکم لگانا (۳۔ منطق) وہ جملہ یا فقرہ جو صدق و کذب کا احتمال رکھتا ہو جسے اصطلاح میں جملہ خبریہ کہتے ہیں (۴) جملہ۔ فقرہ۔ عبارت کا ٹکڑا (۵۔ ا) مباحثہ۔ بحث۔ تکرار۔ جھگڑا۔ ٹنٹا۔ فساد۔ جھنجھٹ۔ دنگہ فساد (۶) منطق کی شکل۔ مسئلہ منطق (۷۔ ا) نالش۔ مقدمہ۔ جیسے قضیۂ زمین برسر زمین

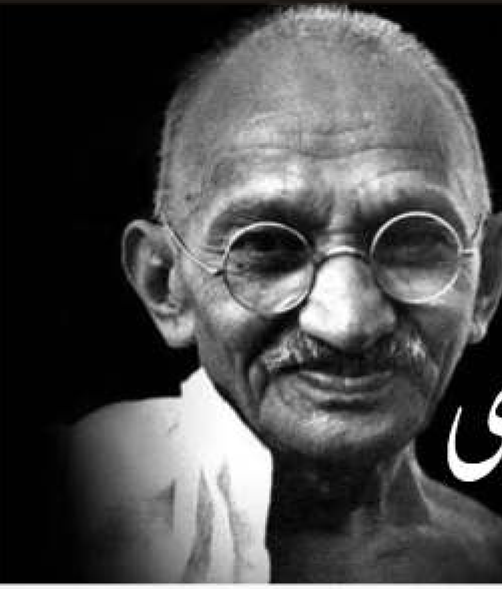

امریتا کماری پانڈے

اہنسا کا پجاری: مہاتما گاندھی

ہندوستان کی سرزمین پر کئی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے کردار و عمل، سیاسی شعور اور دانش وری کی بدولت قائدانہ رول ادا کیا ہے ان میں ٹیپو سلطان، رابندر ناتھ ٹیگور، ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی بطور خاص قابل ذکر ہے ان مقتدر ہستیوں نے ملک کو آزاد کرانے اور قومی بیداری پیدا کرنے میں جو قائدانہ مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ میں علاحدہ باب کا حکم رکھتے ہیں۔

گاندھی جی کے ذہنی وفکری برگ وبار ہندو روایات وعقائد کے ماحول میں پروان چڑھے۔ انھوں نے بھگوت گیتا اور رامائین کا گہرا مطالعہ کیا تھا، جس کے اثرات ان کی فکر وبصیرت پر مرتب ہوئے اور اس کا اعادہ زندگی بھر کرتے رہے۔ ابتدائی تعلیم راجکوٹ میں حاصل کی بعد ازاں وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلینڈ گئے۔ اور وہاں سے بیر سٹری کی ڈگری لی۔ واپس آکر بمبئی میں وکالت شروع کی اس عرصے میں گجرات کے ایک تاجر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں جنوبی افریقہ جانا پڑا، جہاں انھوں نے دیکھا کہ جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جارہا ہے اور امتیازات برتے جارہے ہیں۔

ہندوستانیوں کے تئیں نفرت اور توہین آمیز عمل کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اس برائی کو دور کرنے اور ہندوستانیوں کے وقار کو بحال کرنے کا عہد کیا۔ یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ افریقہ میں مقیم ہندستانیوں پر ظلم وتشدد کے خلاف انھوں نے نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ انصاف کے لئے جدو جہد بھی کی اور مقدموں کی پیروی بھی کی۔ نتیجتاً بڑی تعداد میں ہندستانی افراد کو انصاف ملا اور قید وبند کی صعوبتیں سے نجات ملی۔

انھوں نے افریقہ میں ہی عہد کرلیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر وہ ڈیڑھ سو سالہ غلامی کی زنجیر کو کاٹ ڈالیں گے اور ہندستانیوں کے دل میں حب الوطنی کے جذبے کو انگریزوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔ گاندھی جی ہندوستان واپس آنے کے بعد عملی سیاست میں کود پڑے اور تحریک آزادی کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا۔ اس زمانے میں متعدد سیاسی لیڈران جنگ آزادی کی جدو جہد میں مصروف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، محمد علی جوہر، شوکت علی وغیرہ جیسی سرکردہ شخصیتیں سرگرم عمل تھیں۔

گاندھی جی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سچائی اور اہنسا کا راستہ اپنایا اور اسی کے بل بوتے پر انگریزوں کے خلاف آندولن شروع کیے بعد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کے درمیان سچائی اور اہنسا کو بطور حربہ استعمال کیا جانے لگا۔ وہ سماج میں پھیلی تفریق کے سخت مخالف تھے انھیں یہ شدت سے احساس تھا کہ ذات پات کی تفریق ملک کی آزادی، سماج کی فلاح و بہبود میں رکاوٹ بن سکتی ہے چنانچہ اخوت ومحبت اور یکجہتی پر بطور خاص توجہ دی اور برابری کا نعرہ دیا۔

واضح رہے کہ مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ سے 9/جنوری 1915 کو ہندوستان واپس آئے اور بمبئی میں قدم رکھا تو گوپال کرشن گوکھلے نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ آپ پورے ملک میں گھوم کر ہر حصے کا جائزہ لیں۔ اپنے سیاسی استاد کے اس مشورے پر گاندھی جی ملک کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہوئے بنگال کے مشہور ومعروف مصنف رابندر ناتھ ٹیگور سے ملنے شانتی نکیتن پہنچے وہیں پر سب سے پہلے ٹیگور نے گاندھی جی کو مہاتما کہا مہاتما گاندھی ہمیشہ Third class میں سفر کرتے تھے۔ تاکہ ملک کی اصلی حالت کا جائزہ لے سکیں۔ مئی 1915 میں گاندھی جی نے احمد آباد کے نزدیک کوچرو میں اپنا آشرم بنایا لیکن وہاں پلیگ پھیلنے کے سبب سابرمتی میں آشرم کو منتقل کرنا پڑا۔ دسمبر 1915 میں کانگریس کی بیٹھک

میں حصہ لیا۔ گاندھی جی نے یہاں محسوس کیا کہ ہندوستان کے بکھرے ہوئے صوبوں اور علاقوں کے امیر غریب ہندو مسلم یعنی قوم کے سارے افراد کو شدید تکلیف ہے کہ ہمارا ملک غلام ہے اس وقت کے وہ کرشمائی رہنما تسلیم کئے جاتے تھے جو قیام جنوبی افریقہ کے دوران سب کو ساتھ لے کر چلے اور نسل پرست حکومت سے لوہا لیا اور کامیاب بھی ہوئے تھے۔

گاندھی جی نے پہلی بار ہندوستان میں اپنی تحریک کا آغاز چمپارن ستیہ گرہ سے کیا۔ انگریزوں کے تین کٹھیا قانون سے نیل کسانوں کو نجات دلانے میں ان کی یہ جدوجہد میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ یہ ستیہ گرہ ہندستانی عوام میں جدو جہد کی ایک نئی شروعات تھی، جس کی بدولت گاندھی جی کو ملک گیر پیمانے پر نہ صرف مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اس ستیہ گرہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی لے تیز ہوگئی۔ بعد میں یہی ستیہ گرہ ان کا ہتھیار بنا اور اسے ہندستانی سیاست میں عوامی طاقت کے طور پر دیکھا گیا، جس نے انگریزوں کی نیندیں حرام کردیں۔ گجرات کا کھیڑا علاقہ جو قحط کا شکار تھا، سردار پٹیل اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت سے ٹیکس میں راحت کا مطالبہ کرتے ہوئے ستیہ گرہ شروع کردیا۔ ستیہ گرہ کے آگے انگریزوں کو جھکنا پڑا۔ کسانوں کو راحت ملی اور سبھی قیدی آزاد کردئے گئے۔ گاندھی جی کی مقبولیت ملک کے تمام حصوں میں پھیل گئی یہی نہیں کھیڑا علاقے سے سماجی اصلاح کا کام بھی شروع کیا۔ یہاں کے باشندوں کو صفائی کا سبق سکھایا اور شرابیوں کو شراب کی لت سے باز رہنے کی عادت ڈلوائی۔

1914 سے 1918 تک پہلی عالمی جنگ کے دوران انگریزوں نے رائلٹ ایکٹ کے تحت پریس کی آزادی پر بندش لگادی تھی۔ اس ایکٹ کے بنا پر بغیر کسی تحقیقات کے کسی کو بھی قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی نے پورے ملک میں رائلٹ ایکٹ کے خلاف مہم چلائی پنجاب میں اس ایکٹ کی بطور خاص مخالفت ہوئی پنجاب جاتے وقت گاندھی جی کو قید کرلیا گیا۔ 13/اپریل 1919 میں بیساکھی کے تیوہار پر جس میں ہندو مسلم سکھ سب شامل تھے۔ بمقام امرتسر کے جلیاں والا باغ میں جمع تھے۔ جلیاں والا باغ چاروں طرف سے مکانوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر جانے کے لئے محض ایک ہی دروازہ تھا وہاں ایک پبلک اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں رہنماؤں کی تقریریں ہورہی تھیں۔ جنرل ڈائر نے نکلنے کے اس اکلوتے دروازے کو بھی بند کردیا اور وہاں بے گناہ بچوں، عورتوں اور مردوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس جاں کاہ حادثے سے ملک کے عوام میں سخت بے چینی اور ناراضگی پیدا ہوئی۔ گاندھی جی نے کھل کر برطانوی حکومت کی مخالفت کی۔ اب ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جس سے برطانوی حکومت کی بنیادیں مسمار ہوجائیں۔

اسی زمانے میں خلافت تحریک وجود میں آئی اور ہندو مسلم اتحاد پر بطور خاص توجہ دی گئی۔ گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون شروع کیا جس کے منفی اثرات درآمدا شیا پر مرتب ہوئے اور حکومت کو مالی خسارہ بھی ہوا جس کے سبب انگریزوں نے ظلم و جبر میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ان کا خیال تھا کہ زیادتی اور جبر کے بنا پر وہ تحریک آزادی کو کچل دینگے تاہم ان کے منصوبے پر گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے پانی پھیر دیا۔

1921 میں گاندھی جی کو کانگریس کا صدر بنایا گیا۔ عدم تعاون کا مقصد اب مکمل آزادی حاصل کرنا رہ گیا تھا۔ انہوں نے صدر بنتے ہی کانگریس کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ عوامی جذبات سے جوڑنے میں خصوصی دلچسپی لی اس دوران انہوں نے ایک کمیٹی بھی بنائی تا کہ عدم تعاون کی تحریک کا احتساب اور نگرانی کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ جب یہ تحریک شدت اختیار کرنے لگی اور چوری چورا جیسے پرتشدد واقعات رونما ہوئے تو گاندھی جی کو 1922 میں عدم تعاون تحریک کو واپس لینا پڑا 1925 سے 1928 تک گاندھی جی سماجی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوئے۔

1930 میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہندوستانیوں نے ”سائمن کمیشن واپس جاؤ“ کے نعرہ لگائے۔ رفتہ رفتہ کانگریس کا دبدبہ بڑھنے لگا گاندھی جی نے تمام ہندوستانیوں میں حب الوطنی کا جذبہ بخوبی پیدا کیا اور تمام قوموں کو ایک دھاگے میں پیرونے کی کوشش کی۔ ان کا یہ کہنا حق بجانب تھا کہ ہندستان کو آزادی اسی وقت نصیب ہوسکتی ہے جب یہاں کی عوام آپسی محبت اور بھائی چارے کو اپنا شعار بنالے۔ اس تحریک کو ختم کرنے کے لئے وائے سرائے لارڈ اروِن نے 1929 میں ہندوستان کے لئے Dominion states کا ایک مبہم سا اعلان کردیا۔ اس معاملے میں کچھ طے بھی نہیں کیا گیا۔ ہندوستانی آئین بنانے کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ 32-1930 میں تین گول میز کانفرنس ہوئیں۔ گاندھی جی جب 1932 میں قید سے رہا ہوئے تو گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا جس کے تحت سارے قیدیوں کو رہا کردیا گیا اور سبھی کو سمندر کے ساحلی علاقوں میں نمک بنانے کی چھوٹ دے دی گئی۔

گاندھی جی کے دوسرے گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد کچھ اور رعائتیں سرکار کی طرف سے دی گئیں۔ 1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بنا پھر دو سال بعد محدود ووٹ کے حق کے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔

برطانوی حکومت نے ستمبر 1939 دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کو

بغیر رضا مندی کے جنگ میں جھوک دیا۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی جاپان پر نیوکلیر حملے ہوئے۔ اس حملے سے گاندھی جی بے حد رنجیدہ ہوئے اور کھل کر مذمت کی۔ حکم عدولی کے باوجود سچ اور اہنسا کا دامن کبھی نہیں چھوڑا 1942 میں گاندھی جی نے ''انگریزوں بھارت چھوڑو'' تحریک چلائی۔ جس میں ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا جنگ آزادی میں گاندھی جی کی اہمیت رفتہ رفتہ بلندی پر پہنچ گئی آخر کار انگریز مجبور ہوگئے اور برٹین کے موجودہ وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹل کے حکم پر کیبنٹ مشن 24 / مارچ 1946 کو ہندستان آیا اور 15 / اگست 1947 کو ہمارے ملک کو مکمل طور پر آزادی مل گئی۔

لیکن افسوس کہ آزادی کے فوراً بعد ہی ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے فرقہ وارانہ فسادات ہونے کے سبب ہزاروں افراد کشتِ دخون کے شکار ہوئے، گاندھی جی پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے بھوک ہڑتال کیے اور فساد زدہ علاقوں میں جا کر لوگوں کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ تمام زندگی سچ اور اہنسا کے راستے پر چلنے والا یہ صوفی 30/ جنوری 1948 کی شام ہنسا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ان کی موت سے سارا ملک مغموم اور اداس ہو گیا۔

ہندوستان کی آزادی کے ہیرو مہاتما گاندھی کی وفات کو 70 سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد باوجود حیرت انگیز طور پر ان کی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ مارٹین لوتھر سے لے کر براک اوباما تک نے اپنے لئے مہاتما گاندھی کو ایک مثالی شخصیت قرار دیا۔ گاندھی جی ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے بتائے ہوئے اصول و نظریات ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان پر عمل کر کے ہم ہندوستان میں امن و امان قائم رکھ سکتیں ہیں جو ہمارے ملک کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔☐☐☐

Dr.Amrita Kumari Pandey
L.43,Tulsidas Colony
BHU,Varanasi- 221005 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

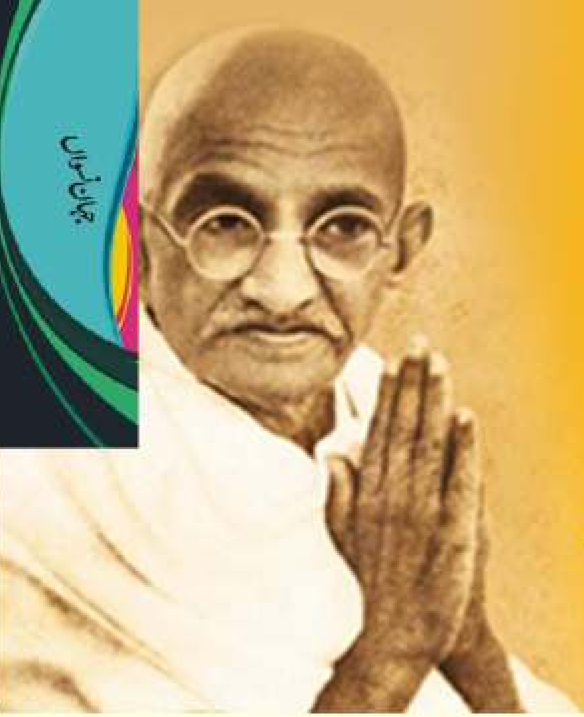

فرحت زیبا

گاندھی جی کا مذہبی واخلاقی تصور

عمومی طور پر عالموں کے نزدیک مذہب اور اخلاق دو مختلف تصور ہیں۔ اخلاقیات کا تعلق معاشرتی زندگی سے ہے جب کہ مذہب کا تعلق خدا کے احکام کی پیروی ہے۔ لیکن اس خیال پر غور وفکر کیا جائے دونوں میں کوئی بُعد یا تفریق نہیں ہے اس لیے کہ انسان دو مختلف فرائض اور جوابدہی کے درمیان اپنی زندگی گزارتا ہے یعنی انسانوں کے حقوق کی ادائیگی اور خدا کی بابت جوابدہی جسے حقوق اللہ اور حقوق العباد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دونوں فرائض کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور اس کے پس پردہ انسانی فلاح وصلاح کا مقصد پوشیدہ ہے۔

مہاتما گاندھی مذہب اور اخلاق کو ایک دوسرے کا لازمہ تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب اور اخلاق ایک دوسرے سے علاحدہ قطعی طور پر نہیں رہ سکتے ان کے نزدیک کوئی مذہب اگر غیر اخلاقی تعلیم پر توجہ دے تو اسے مذہب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا یہاں تک کہنا تھا کہ کوئی انسان ظالم و جابر ہو، جھوٹ، مکر وفریب میں مبتلا ہو اور خدا سے امداد کی توقع رکھے یہ ممکن نہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ گاندھی جی کے ان خیالات کے پس پردہ وہ کون سے دلائل تھے جس کی بنا پر وہ دونوں کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔

مہاتما گاندھی کے مطابق خدا صرف حقیقت اور صداقت ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یہ مذہبی تصور اصلاً وحدانیت کے پہلو بہ پہلو اس کی بڑائی، عظمت اور حقانیت کے علاوہ دنیا کو پست قرار دینے کا تصور پوشیدہ ہے۔

مذہب کا عمومی تصور یہ ہے کہ نادیدہ خدا اور اس کی طاقت وحکم کی بابت انسان کا سرنگوں ہونا، مہاتما گاندھی اس خیال کے مخالف نہ تھے بلکہ اس اضافے کے ساتھ کہ وہ تمام قوتوں سے بالاتر ہے اور اس کی قوت ہی ستیہ یا صداقت ہے بقیہ فنا ہونے والی طاقتیں ہیں۔

گاندھی جی نے وقتاً فوقتاً گیتا کے حقائق اور سندیش پر توجہ دی ہے جس سے لوگوں میں یہ خیال جنم لیتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو فوقیت دیتے تھے اور اسے ترجیحی طور پر زندگی میں برتتے تھے۔ لیکن گاندھی جی نے واضح کیا کہ وہ مذہب سے ہندو مذہب یا کوئی اور مذہب مراد نہیں لیتے بلکہ مذہب کسی مخصوص مذہب سے بالا تر ہے۔ ان کے نزدیک مذہب وہ ہے جو انسانی خیالات، تصورات اور اعمال کو پوری طرح تبدیل کرے، جو انسان کو صداقت سے جوڑ دے اور خود احتسابی کا ذریعہ بن جائے۔ یعنی Knowing Self کا عمل بہ قول اقبال ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

احتساب کا یہ عمل انسان کے تزکیہ نفس کے علاوہ عوامی ہمدردی اور دلسوزی کو فروغ دینے اور اقدار حیات کو استحکام بخشنے کا عمل ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی کے مطابق مذہب انسان کی اندرونی قوتوں کو مفاد عام میں برتنے کا عمل ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی کا تصور مذہب انسانی بھلائی کا دوسرا نام ہے۔ انسان بذات

خود بنی نوع انسان کی بہتری کا خواہاں واقع ہوا ہے اور یہ اس کی فطرت بھی ہے اپنی انا اور خود غرضی وحرص کے باعث اس اہم صفات سے محروم ہو جاتا ہے اور یہیں سے انتشار، بدامنی اور تشدد جیسے منفی اعمال جنم لینے لگتے ہیں۔ گاندھی جی مذہب کو ایک ایسا آلہ تصور کرتے ہیں جس کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترقی اور خوشحالی ممکن ہے۔ ان کے نزدیک عبادت روح کی طاقت ہے جس سے انسان کا ظاہر اور باطن دونوں متاثر ہوتا ہے۔

مہاتما گاندھی مذہب کو جینے کا ایک ڈھنگ، اصول اور نظریہ قرار دیتے ہیں جس کی رو سے انسان میں جنم لینے والے تمام منفی خیالات معدوم ہو جاتے ہیں۔ وہ مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دیتے ہیں تاہم دوسرے مذاہب کی قدر کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ گاندھی جی کا جس مذہب میں جنم ہوا اور جس ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی اس لحاظ سے ہندو روایات اور تہذیب سے عقیدت رکھنا ایک فطری بات تھی۔ وہ 'گیتا' اور 'رامائن' جیسی مقدس کتابوں کو اپنا استاد سمجھتے تھے لیکن دوسرے مذاہب کو بھی وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی توجہ طلب ہے کہ ہر مذہب میں ایسے اصول موجود ہیں جس کا تعلق بنی نوع انسان کی بقا سے ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی کے نزدیک تمام مذاہب حقیقت پرمبنی ہیں لہٰذا ایک جگہ لکھتے ہیں 'ہمیں تمام مذاہب اتنے ہی پسند ہیں جتنا ہندو مذہب وہ اس بات کو بھی باور کرتے ہیں کہ مذہبی ٹکراؤ کے پس پردہ وہ خیالات ہیں جو دوسرے کو ہیچ اور کمتر دکھاتے ہیں، چنانچہ تمام مذاہب کا احترام ہی ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے جس کی بنیاد پر اختلافات اور تصادم سے بچا جا سکتا ہے۔ وہ اخلاق کو اقدار کے زمرے میں جگہ دیتے ہیں۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گاندھی جی کا تصور مذہب اور اخلاقیات میں کوئی امتیاز یا تضاد نہیں ہے بلکہ یہ وہ قوت ہے جس کے سہارے انفرادی اور اجتماعی قوم و ملک بین الاقوامی سطح پر امن وشانتی کی بحالی میں مددمل سکتی ہے اور یہی تصور ہمیں دھرتی کے باسیوں کی بھگتی کی طرف لے جاتا ہے۔

□□□

Dr. Farhat Zeba
Lane No.1
Sattar Colony, Bariatu
Ranchi-834009 (Jharkhand)

فرہنگ آصفیہ

قصیدہ — ع۔ اسم مذکر۔ لغوی معنی ٹھوس اور بھرا ہوا مغز یا دماغ سطبر مگر ہماری اور نیز صاحب کشف الغات کی رائے کے موافق یہ لفظ قصہ سے مشتق ہوا ہے یعنی اس قدر نظم لکھی کہ شاعر قصیدہ کے تمام مراتب جس میں مدح وذم گردش زمانہ۔ حسن و عشق۔ بہار، وگلزار ودعا وغیرہ کا بیان شامل ہے۔ طے کرکے اپنے مقصود پر لاڈالے۔ جن لوگوں نے ٹھوس مغز کے معنی میں یہ لفظ لکھا ہے وہ بھی یہی دلیل لاتے ہیں۔ کہ شاعر تمام حالت کو نظم میں بھر کر پھر اپنا مقصد بیان کرتا یا یوں کہو کہ کثرت سے مضامین جلیلہ لاتا ہے۔ پس اس وجہ سے پر مغز کہنا بے جا نہیں جب غزل اپنی حد سے گزر جائے تو وہ بھی قصیدہ ہی بہ لحاظ تعداد خیال کیا جاتا ہے۔ غزل اوّل درجہ پانچ شعر کی اور زیادہ سے زیادہ اکیس شعر کی ہوتی ہے قصیدہ کم سے کم پندرہ شعر کا اور زیادہ کی انتہا نہیں۔ غرض قصیدہ وہی ہے جو کسی کے واسطے بالقصد مدح یا ذم پند یا حکایت کے طور پر نظم کیا جائے اور اس کے اول بیت کے دونوں مصرعے ابیات دیگر کے مصرعہائے ثانی سے ہم قافیہ ہوں۔ قصیدے میں چند امور کا لحاظ رکھنا واجبات سے ہے۔ مثلاً تشبیب یعنی تمہید۔ دوم حسن تخلص۔ یا گریز یعنی تمہید سے مضمون مدح کی طرف دوڑنا۔ سوم تعریف ممدوح۔ چہارم حسن الطلب یعنی ایک لطف اور انداز کے ساتھ اپنا مقصد بیان کرنا۔ پنجم دعا۔ اس میں شرطیہ ہو خواہ بلاشرط۔ جیسے حضرت ذوق کے اس قصیدہ میں جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے

سیر آرائے گردوں جب تلک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو
ترا مداح دائم خسرو اذوق سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گر ہو (ذوق)

نعمتِ غیر مترقبہ

شاہدہ شاہین

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اپنے چہرے پر دھوپ کی حدت کو محسوس کر کے فضل دین کی آنکھ کھل گئی۔ کل رات باورچی خانہ میں جا کر صبح کی بچی کچھی دال روٹی بڑی مشکل سے حلق سے نیچے اتاری پھر سونے کے لیے چارپائی پر لیٹا تو نیند ندارد۔ کمرے کے اندر چھائی ہوئی ناقابلِ برداشت گرمی اور حبس کی شدت سے تنگ آ کر وہ اپنی کھٹیا آنگن میں لے آیا اور اپنے تھکے ہارے وجود کو کھٹیا پر گرا دیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو ہوا کے جھونکے تھپکی دیتے ہوئے محسوس ہوئے اور پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

بیدار ہوتے ہی اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا......گزشتہ کئی دنوں سے جھاڑو نہ دینے کی وجہ سے آنگن میں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔ ایک کونے میں نل کے پاس ڈھیر سارے گندے برتن بھانڈے بکھرے پڑے تھے۔ بستر سے اٹھ کر گھر کے اندر جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ جانتا تھا کہ باورچی خانہ مزید خستہ حالت میں ہے۔

اس کی بیوی سلیمہ کو مائکے گئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ اس نے پہلے بھی کئی دفعہ سلیمہ پر ہاتھ اٹھایا تھا، ہمیشہ مار کھانے کے بعد وہ چپ چاپ اپنی آنکھیں پونچھ کر حسبِ معمول گھر کے کاموں میں لگ جاتی تھی لیکن اس مرتبہ نہ جانے اسے کیا ہوا کہ خلافِ توقع پیچھے مڑ کر زخم خوردہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر منہ سے بہہ رہے خون کو آستین سے پونچھتے ہوئے اپنے کپڑوں کی پوٹلی اٹھا کر بغل میں داب لی اور باہر نکل گئی۔ فضل دین دیکھتا رہ گیا......

سلیمہ بی بی تیرہ سال کی عمر میں اس کی بیوی بن کر اس کے گھر آئی تھی۔ اس کے فطری حسن اور معصومیت سے مرعوب ہونے کے باوجود فضل دین نے اپنے دلی جذبات کو چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ جلد ہی اس کا ایک اور جوہر بھی کھل کر سامنے آ گیا......وہ نہ صرف حسنِ اخلاق کی مالک تھی بلکہ کم سن ہونے کے باوجود امورِ خانہ داری میں بھی ید طولیٰ رکھتی تھی۔ فضل دین نے کبھی دوسروں کے جذبات کا پاس نہیں رکھا تھا چہ جائیکہ بیوی کے اوصاف کا کھلے دل سے اقرار کرتا۔

اس گاؤں میں رہنے والے بیشتر مردوں نے نہ جانے کس بنا پر اپنا ہی ایک نظریہ قائم کر رکھا تھا چنانچہ عملی طور پر سب اسی امر قیاسی پر کاربند تھے۔ فضل دین اکثر ایک تجربہ کار اور دانا کی طرح اپنے قریبی دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر عورت اور ایک جوتی کی خصلت و طینت میں مماثلت ثابت کیا کرتا، سب کے سب تصدیق میں اپنے سر ہلاتے رہتے۔

سنا تھا کہ جانے کس بات پر خفا ہو کر سہاگ رات میں ہی بیوی کے تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ ایسے سنگدلانہ رویہ کو ملاحظہ کر کے لوگوں کے دلوں میں سلیمہ کے لیے افسوس اور ہمدردی عود کر آئی۔ سب یہی کہتے تھے کہ فضل دین جیسا ناقدرا اس نعمت کا اہل نہیں ہے۔ اسی سخت گیر رویے کی وجہ سے دور پار کے رشتہ دار اس کے یہاں آنا پسند نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سگے بھائی بند بھی فاصلہ بنائے رکھنے میں ہی عافیت جانتے تھے۔ بچے شروع سے ہی اس کی اجارہ داری سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ جب بڑے ہو گئے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنے تو ملازمت کے بہانے اس ماحول سے دور ٹھکانے بنا لیے۔

بیوی کے رہتے اس نے کبھی کسی کی پروا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اصل میں اس کا ساتھ گویا ایک دنیا کے برابر تھا۔ وہ بے چاری کولھو کے بیل کی طرح دن رات گھریلو امور میں مشغول رہتی، اس کی ایک چھینک اور ذرا سی کھانسی پر بھی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ دن اور

رات کی تمیز نہ کرتے ہوئے ہر وقت اپنے مجازی خدا کو آرام اور آسانیاں مہیا کرنے کی تگ و دو میں لگی رہتی۔

فضل دین اکثر کہا کرتا تھا کہ بیوی اور جوتی جس قدر پرانی ہوں اتنی ہی آرام رساں ہوتی ہیں۔ اکثر انسان کو اپنے دورِ جوانی میں بیوی کے ضمنی صفات کا احساس نہیں ہوتا، خاصی عمر ڈھل جانے کے بعد جب ادراک ہوتا ہے تو یہ احساس حالتِ اضافی (possessive) میں شامل ہوجاتا ہے۔ خیر سے اب تو دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن فضل دین کے برتاؤ میں ذرا بھی لچک نہیں آئی تھی۔ جب تب بیوی کی دھلائی نہ کرتا اس کی ہتھیلی میں کھجلی ہوتی رہتی۔

سلیمہ جب اچانک چلی گئی تو پہلے پہل کوئی فکر نہیں ہوئی لیکن بہت جلد احساس ہوگیا کہ عمر کے اس پڑاؤ پر ایک ساتھی کے بغیر زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہے۔ جب تک وہ ساتھ تھی گویا ہر چیز اس کی دسترس میں تھی بس ذرا سا ہاتھ بڑھانے کی دیر ہوتی۔ اب یہ حال تھا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی ڈھیر سارے ناقابلِ تسخیر مسائل اور پریشانیاں جن کے بارے میں کبھی سوچنے کی نوبت نہیں آئی تھی ایک سوالیہ نشان بنے سامنے کھڑے ملتے۔

بیوی گھر سے کیا گئی اس کے لیے دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھی تھیں، شوہروں کے کہنے پر کب تلک اس کی خاطر تواضع کرتیں۔ رفتہ رفتہ سب نے ہاتھ کھینچ لئے۔ فضل دین کو شدید فکر لاحق ہوگئی کہ اس مسئلے کو کیونکر سلجھایا جائے! بیوی کو کس طرح واپس گھر لائے۔

کافی سوچ وچار کے بعد اس نے گاؤں کے مکھیا کے پاس جا کر اپنی شکایت پیش کی۔ مکھیا نے چھوٹتے ہی کہا: ''یہ کام تو اُسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ کوئی دوسری ہوتی تو کب کا چلی گئی ہوتی...... اللہ نے عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا اُسے راحت سکون اور اطمینان مہیا کرنے کے لیے۔ عورت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کے ساتھ قرآن اور رسولؐ کے ذریعے قائم کردہ احکام کے موافق سلوک روا رکھا جائے تو زندگی گلزار بن جاتی ہے۔ اگر خلاف ورزی کی تو بے شک قیامت کے دن اوپر والے کے آگے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ تو نے بھلا کس بنا پر عورت کو پیر کی جوتی کے برابر سمجھ لیا......''

جب چاروں طرف سے بے طرح مذمت وتنقید کا سامنا کرنا پڑا تو سوچا اس طرح اپنی دال نہیں گلنے والی لہٰذا قانون کا سہارا لینے کی ٹھانی اور سیدھا پولیس تھانہ پہنچ گیا۔ انسپکٹر کے آگے رو کر اپنی پتا سنا دی۔ اس کی کہن سالی کو ملاحظہ کر کے جواں سال انسپکٹر کو ترس آ گیا۔ ویسے بھی پولیس کا کام ہے عام آدمی کی داد رسی کرنا چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ بہرحال معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس نے پڑوس کے گاؤں سے سلیمہ بی کو بلوا بھیجا۔ تھانے آ کر جب اس نے فضل دین کو وہاں بیٹھے دیکھا تو جھٹ سے منہ پھیر کر واپس جانے لگی۔ ایک حوالدار نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک دیا۔ اور بولا:

''صاحب نے بلوا بھیجا ہے تو تم ان کی اجازت کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتیں۔''

وہ مجبوراً وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ فضل دین سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سلیمہ ایسی جرأت کر سکتی ہے۔ فضل دین اور اس کے ساتھی عورت کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں تھے۔ ہو نہ ہو یہ اسی ماسٹرنی کی کارستانی ہے جو مکھیا اور دوسرے چند نوجوانوں کی سرپرستی حاصل کر کے گاؤں میں تعلیم بالغاں کی جماعتیں منعقد کرواتی تھی۔ وہ اپنے گاؤں میں رونما ہونے والے اس ناگہاں انقلاب کے خلاف مزاحمت کرنے میں ناکام رہ گئے تھے۔

اچانک اس کے تصور میں وہ مناظر گھومنے لگے ...... جب وہ وقت بے وقت جب جی چاہے گھر آتا بیوی اس کے انتظار میں چولہا گرم رکھتی تھی۔ جیسے ہی اس کے آنے کی آہٹ ملتی جھٹ سے توا چولہے پر رکھ کر گرم گرم روٹیاں سینک دیتی۔ بیوی کے گھر آنے کے بعد کیا مجال جو اس نے کبھی ٹھنڈا یا باسی کھایا ہو۔ زچہ پن کے دوران بھی بستر سے اٹھ کر اس کے لیے تازہ گرم روٹیاں پروسی تھیں ..... فضل دین نے برا سا منہ بنا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کمبخت اسی نے میری عادت بگاڑ دی جواب روکھی سوکھی اور باسی گلے کے نیچے اترتی ہی نہیں۔''

انسپکٹر دوسری طرف مصروف تھا۔ بیک وقت کئی لوگوں سے الجھ رہا تھا۔ سب سے نبٹنے کے بعد وہ ان کی طرف متوجہ ہوا...... ''سلیمہ بی بی تمہارے شوہر نے شکایت درج کروائی ہے کہ تم نے اس عمر میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے بھائیوں کے گھر جا کر رہنے لگی ہو۔''

''ہاں'' سلیمہ نے تھکے تھکے سے لہجے میں جواب دیا۔ ''صاحب میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ لے آئیں کوئی دوسری کیونکہ اب مجھ میں ان کی مار سہنے کی تاب نہیں رہی۔'' انسپکٹر نے خشمگیں نگاہوں سے فضل دین کی طرف دیکھا۔

فضل دین نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس طرح نجی معاملہ کو آشکارا ہوتے دیکھ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس کے ایک تھپڑ رسید کر دے

مگر کوتوالی کا معاملہ تھا، اتنی عقل تو تھی کہ اگر ایسی کوئی حرکت کی تو لینے کے دینے پڑ جائینگے۔ فضل دین کو مزید خدشہ تھا کہ وہ انسپکٹر کے آگے شکایتوں کا دفتر کھول کر رکھ دے گی اور اس کا اصلی چہرا بے نقاب کر دے گی۔ حمایتوں اور گواہوں کی بھی کمی نہیں ہوگی۔

اس کی توقع کے برعکس وہ سادگی سے بولی: ''دراصل میری صحت پہلے جیسی نہیں رہی۔ بیٹے نے بھی اپنے پاس بلایا لیکن ہم گاؤں والوں کو شہری آب وہوا کب راس آتی ہے۔ صاحب! جب تلک ٹھیک ٹھاک تھی تب تلک میں نے ان کی خدمت گزاری میں کوئی کوتاہی نہیں دکھائی ،اب جب کہ مجھ سے کام دھام نہیں ہوتا تو میں نے خود کو ان سے الگ کرلیا ہے۔'' پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: ''پھٹی پرانی جوتی بھلا کس کام کی۔'' اچانک اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔

فضل دین چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آج پہلی بار اس کے چہرے کا بغور معائنہ کیا تو احساس ہوا کہ اس کے وجود میں واضح طور پر ایک غیر معمولی تغیر آچکا ہے۔ فضل دین کی نگاہوں میں وہ تصویر گھوم گئی جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجسم بہار تھی، جوانی اور معصومیت کا حسین امتزاج جس نے اپنی بے لوث محبت اور بے انتہا الفت اس پر نچھاور کر دی تھی۔ بھلا فضل دین سے بہتر اور کسے پتا ہوسکتا تھا کہ بدلے میں اُسے کیا ملا تھا! نہ جانے کیوں اس کا جی بھر آیا اور کانوں میں کھیا کے ذریعے کہی گئی باتوں کی بازگشت ہونے لگی۔۔

آج پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں ایک خیال نے جست لگائی ......'' یہ عورت اتنا عرصہ میرے گھر رہی۔ میرے یہاں دھن دولت کی کمی نہیں تھی لیکن اس نے کوئی فرمائش کرنا تو درکنار میری زیادتیوں پر بھی مزاحمت بھی تو نہیں کی ہمیشہ میری فکر کرتی رہی......نہ جانے اس نے کس قدر مجبوری میں گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہوگا!''

پھر وہ اپنا احتساب کرنے لگا۔ ''اور میں نے کبھی دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ تیرا جی کیسا ہے؟ ایک وقت بھی نہیں پوچھا کہ تو نے کھانا کھالیا؟ آیا تجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جیسے وہ گوشت پوست کی انسان نہیں بلکہ ایک مشینی کل پرزہ ہو۔''

ویسے اتنے دنوں کی جان لیوا تنہائی کے نتیجے میں دھن دولت ،یار دوست اور اولاد کے مقابلے میں ایک بے لوث رفیقِ سفر کی اہمیت اس پر واضح ہوچکی تھی اور یہ بھی باور ہوگیا تھا عمر کے آخری پڑاؤ پر ایک وفا شعار بیوی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔

اچانک دونوں کی نظریں ملیں، فضل دین کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہہ رہی ہوں......'' ساری عمر یہی انتظار رہا کہ کبھی تو اپنی وفاؤں کا صلہ ملے گا، محبت مروت والتفات کے پھول مہکیں گے لیکن سوائے خارزار کے اپنے نصیب میں کچھ نہیں لکھا شاید لہو لہان دامن لے کر جینا ہی اپنا مقدر ہے......''

فضل دین اس سے نظریں چرانے لگا پھر یکا یک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بیوی کا بازو تھام کر اسے باہر لے جانے لگا اور وہ پریشان ہوکر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ انسپکٹر بھی اس کی مدد کے لیے کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فضل دین بولا: ''صاحب میں اپنے گھر والی کو اس کے اپنے گھر لیے جا رہا ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے کہ اگر گھر میں عورت نہ ہو تو گھر گھر نہیں لگتا۔''

انسپکٹر نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو وہ فوراً بولا: ''میں اس کے لیے ایک چھوڑ کئی نوکر رکھوں گا اور یہ کھٹیا پر بیٹھے بیٹھے حکم چلایا کرے گی بس۔''

اس کی باتیں سن کر انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی سلیمہ غیر یقینی انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی......شوہر کے چہرے پر چھائے ہوئے عزم اور عقیدت کو ملاحظہ کر کے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر شرم کی لالی چھاگئی۔

□□□

Prof. Shahida Shaheen

371, 6th Cross,

Opp. Nehru Park,Udayagiri

Mysore -570019 (Karnataka)

فرہنگ آصفیہ سے

قفلی ۔ا۔اسم مؤنث۔ (۱) ڈھکنے دار ظرف ۔ جس میں ایک زہ ہونے کے سبب ڈھکنا مثل قفل بند ہو جاتا اور کھولے بغیر نہیں کھلتا ہے ۔ پیچ دار ظرف جو ایک دوسرے میں آکر پھنس جاتا ہے۔ ایک دوسرے میں آتا ہوا نل یا نلی ۔ جیسے حقے کی قفلی۔ برف کی قفلی۔ سالن وغیرہ بند کرکے رکھنے کی قفلی ۔ قُلفی (ب۔بازاری) امرد۔ خوبصورت لڑکا۔

خواب بانٹنے والی

ممتاز رفیق

یہ شاید چوبیسواں منٹ تھا جب میرا کاندھا تھپکتے ہوئے ایک مانوس سی آواز نے کہا: اے مسٹر! آپ اتنی دیر سے ان پینٹنگز کے سامنے جمے کیوں کھڑے ہیں؟ میں اس دخل اندازی پر بدمزا ہو کر ناگواری سے پلٹا۔ وہ اسد تھا۔ میرا ایک نوجوان بے تکلف مصور دوست، آخر آپ نے ان میں ایسا کیا دیکھ لیا؟

اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے میں نے جواباً کہا: یہی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان تصاویر میں ایسا کیا ہے جس نے میرے پیروں کو زنجیر کرلیا ہے۔

وہ سنجیدگی سے بولا: میں اتنی دیر سے کھڑا آپ کے انہماک پر حیران ہو رہا ہوں۔

میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا: اچھا۔ اس نے چھیڑنے کے انداز میں جملہ کسا: لیکن آپ تو مصوری کے بارے میں کوئی شد بد نہیں رکھتے۔ میں نے سامنے لگی پینٹنگ پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا: ہاں، حقیقت تو یہی ہے مگر کسی فن پارے کو سراہنے کے لیے اس کے فنی خواص سے واقفیت کیا ضروری ہے۔ وہ دھیمے سے مسکرایا: آپ نے نمائش کی دیگر تمام تصاویر پر ان ہی کو اتنی اہمیت کیوں دی۔ میں نے اس پر الجھی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا: شاید اس لیے کہ یہ نہایت جاذب نظر ہیں... یا شاید اس کمال کے کلر کمبی نیشن کے باعث یا پھر ممکن ہے ان تصاویر میں برتے گئے موضوع نے مجھے مسخر کرلیا ہو۔ اس نے حیران سا ہو کر مجھے دیکھا: صاحب، آپ تو اچھے بھلے آرٹ کریٹک ہیں۔ میں نے شرمندہ سا ہو کر جواب دیا: نہیں یار یہ تو بس یونہی... اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری: آہ! کاش اِس وقت وہ یہاں ہوتی۔ میں جھلا سا گیا: یار تم نے یہ کیا اوٹ پٹانگ باتیں شروع کردیں کس کا ذکر کر رہے ہو ... کون ہوتی؟ اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا: بھائی! آپ اتنے گاودی کیوں ہیں؟ ارے جناب، وہی آپ کی فیورٹ آرٹسٹ، ان تصاویر کی خالق۔ میں نے تعجب سے سوال کیا: کیا مطلب اس کی پینٹنگز یہاں لگی ہیں اور وہ خود غائب ہے؟۔ اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا: آئیں گیلری کا چکر لگا کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا۔ دروازے پر تاثرات کی کتاب پر نظر پڑی۔ میرا دوست کسی سے باتوں میں مشغول تھا۔ میں لپک کر گیا اور اپنے تاثرات قلم بند کردیے۔ میں نے لکھا: اس گروپ ایگزی بیشن میں یوں تو کئی پینٹنگز بہت اچھی ہیں لیکن میں خصوصیت سے ان پانچ تصاویر کو خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گا جن میں معاشرے کی باطنی خباثت کو Potray کرنے کی کام یاب کوشش کی گئی ہے۔ اپنے دستخط اور رابطے کا نمبر درج کر کے میں دروازے کی طرف بڑھا تو میرا دوست شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھبتی کسی: واہ صاحب، کیا بات ہے۔ معاشرے کی باطنی خباثت.... میں نے اس کی کڑوی بات کو خاموشی سے نظر انداز کردیا۔ وہ پھر گویا ہوا: صاحب، ان میں آپ کو معاشرہ کہاں نظر آگیا؟ وہ تو انسانوں کی مسخ شکلیں ہیں۔ میں نے

ملائمت سے پوچھا: تو کیا انسان معاشرے کا نمائندہ نہیں ہوتا؟ اس نے چپ سادھ لی۔ ہم ذرا دیر میں ایک اوپن ائیر ریسٹوراں میں جا پہنچے۔ وہ خاموشی سے مجھ پر نظریں گاڑے ہونٹوں سے دھویں کے چھلے بناتا رہا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا: آپ کو شاید میری باتیں ناگوار گزریں، مگر کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے اسے کتنا بڑا کمپلیمنٹ دے ڈالا ہے؟ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا: وہ اس سے زیادہ کی مستحق تھی۔ میرا جواب سن کر وہ چڑ سا گیا، بھنا کے بولا: she is just in!Yar making۔ ابھی وہ بہت جونیئر ہے۔ میں نے رسانیت سے جواب دیا: پھر تو وہ اس سے بڑھ کے ہمت افزائی کی حق دار تھی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں...۔ میں نے جان بوجھ کر بات نامکمل چھوڑ دی۔ نہیں، نہیں بات مکمل کریں۔ آج میں آپ کے ایک بالکل نئے رخ سے متعارف ہو رہا ہوں۔ اس کے لہجے کی چبھن پر توجہ دیے بغیر میں نے کہا: میرا خیال ہے وہ مصوری کے ایک بالکل نئے رجحان کو عام کرنے کے جتن کر رہی ہے۔ میری بات سن کر وہ گنگ سا ہو گیا پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگا: آپ نے پوچھا تھا کہ وہ نمائش میں موجود کیوں نہیں ہے؟ بھئی وہ پاگل پن کی حد تک بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ میں نے مسکرا کے چوٹ کی: ہر بڑے کام کے لیے ایک مخصوص دیوانگی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن کیا وہ سرے سے آتی ہی نہیں؟ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا: آتی ہے لیکن بس جوگی کا سا پھیرا، اچانک دن کے کسی بھی پہر آ دھمکتی ہے اور ایک کونے میں کھڑی ہو کر اپنی پینٹنگز پر سرسری نظر ڈال کر گزرنے والوں کو دیکھ کر مسکرائے جاتی ہے۔ میں نے بے یقینی سے پوچھا: مسکرائے جاتی ہے، کیوں؟۔ اس نے کاندھے اچکائے: ہاں، ایک دن میں نے اس مسکراہٹ سے اکتا کر اس سے اس کا مطلب پوچھ ہی لیا۔ میرے سوال پر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے روکھی آواز میں بولی: مسکراہٹ... یہ تو ناقدری اور نااہلی کا ماتم ہے، جسے میں ہونٹوں کے کونوں کی اوٹ میں دابے رکھتی ہوں۔ ابھی میں اس جواب پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس نے کہا: آپ دیکھ لیجیے گا میں اپنی شناخت حاصل کر لوں گی۔ دنیا میں آنکھ والوں کی کمی سہی لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ بینائی بالکل ہی اٹھا لی گئی ہو، آخر مجھے دریافت کر ہی لیا جائے گا۔ میں اس کی خوش فہمیوں پر حیران سا کھڑا تھا کہ وہ تاثرات کی کتاب کی طرف لپکی اور حسب معمول چند صفحات پر طائرانہ نظر ڈال کر یہ جا وہ جا۔ مجھے اس کی ان حرکتوں پر بہت کوفت ہوتی ہے۔ میں نے بغور اس کی بات سنی: اچھا، good اگر کسی کو اپنے فن پر اس قدر اعتماد ہو تو اسے آگے بڑھنے سے کون روک سکتا ہے؟ میری اس بات پر وہ بھڑک اٹھا: آپ بھی کمال کرتے ہیں، ابھی اس نے سیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی تو اس نے جنم لیا ہے، اسے تو ڈھنگ سے اسٹروک لگانے تک نہیں آتے، پہلے وہ اس میں تو مہارت حاصل کر لے۔ میں نے سنجیدگی سے کہا: یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ یقین اور جنون راستے کی ہر رکاوٹ تہس نہس کر ڈالتے ہیں۔ تم دیکھ لینا ایک دن وہ بڑی مصورہ بن جائے گی۔ اس نے خفگی سے کہا: آپ نے اس کی محض پانچ پینٹنگز دیکھیں ہیں اور اس کے بارے میں اتنے بڑے دعوے کر رہے ہیں۔ میں مسکرایا: اب تم بہت ناسمجھی کی باتیں کر رہے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ وہ جونیئر ہو گی لیکن تم نے سنا نہیں پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے سر سہلایا: ہاں، ایک بات ضرور ہے اس نے اپنی لائن پر بہت محنت کی ہے۔ وہ کہتی ہے مصور کو لکیر سے ہمیشہ جڑے رہنا چاہیے اور مجھے آپ کی باتوں سے اختلاف سہی لیکن اسے کام یاب ہوتے دیکھ کر مجھے خوشی بھی سب سے زیادہ ہو گی لیکن...۔ میں نے اسے چھیڑا: لیکن وہ تمہارے مخصوص معیار جمال پر پوری نہیں اترتی۔ کیوں ہے نا یہی بات؟ وہ میری بات سن کر ہکا بکا رہ گیا: کیا مطلب، آپ نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا؟ میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا: کیوں کہ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ خفت سے مسکرایا: آپ بہت ظالم ہیں۔ ہاں، یہ سچ ہے وہ معمولی نقش و نگار کی ایک روکھی پھیکی لڑکی ہے۔ مگر ہمارا موضوع تو اس کا فن تھا۔ میں زور سے ہنس پڑا: میاں اگر یہ پینٹنگز کسی پری پیکر نے بنائی ہوتیں تو تم ان کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہوتے۔ وہ فراخ دلی سے مسکرایا: میں جان بوجھ کے آپ سے حجت کر رہا تھا۔ لیکن جناب اتنی جلد اتنا بڑا کمپلی منٹ اسے برباد بھی کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا وہ ٹھیک کہہ رہا ہے: ہاں، یہ درست ہے مگر میں نے یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی ہے۔ اس نے بے بسی سے ایک ٹھنڈی سانس بھری: کتنا عجیب اتفاق ہے، اس کا دعوا ہے کہ وہ باطن کو پینٹ کرتی ہے اور آج آپ نے بھی بالکل یہی نتیجہ اخذ کیا۔ اس کے لہجے کی صداقت عیاں تھی: ایسا اس لیے ہے کہ تم بھی ان ہی ناقدروں میں شامل ہو جنہوں نے اس کے کام کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں: آج ان تصاویر میں آپ کو منہمک دیکھ کر مجھے اس کی کتنی ہی باتیں یاد آئیں۔ اس نے رک کر پانی کے چند گھونٹ پیئے پھر گلہ کھنکار کر

بولا: آپ کے دیوانے پن پر تو خیر مجھے کبھی کوئی شک ہی نہیں مگر ہماری فن کارہ بھی آپ سے کچھ کم نہیں، میں کسی دن آپ کو اس سے ملواؤں گا۔ میں نے خوش دلی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اب رات خاصی اتر آئی تھی کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہم نے اپنے گھروں کی راہ لی۔ میں بہت رات گئے سونے کا عادی ہوں اور جب سے بیمار ہوا ہوں تب سے دفتر پہنچنے کی ہڑبونگ بھی جاتی رہی، اس لیے کافی دیر تک بستر پر پڑا اینڈتا رہتا ہوں اور دن چڑھے اٹھنے کا عادی ہوں۔ تیسرے یا شاید چوتھے دن ابھی میں نے چائے کا دوسرا گھونٹ ہی حلق سے اتارا تھا کہ فون کی گھنٹی گنگنانے لگی۔ میری بیوی نے لپک کے چونگا اٹھایا، وہ واقف تھیں کہ مجھے ناشتے کے دوران اس قسم کی دراندازی نہایت گراں گزرتی ہے۔ مختصر سی گفتگو کے بعد وہ میری طرف مڑیں: کوئی خاتون، آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے خود کلامی کی: خاتون؟ کون ہو سکتی ہیں۔ کئی نام تیزی سے دوڑتی سلائڈ کی طرح نظروں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے: ہلو، کون؟ ایک نرم و ملائم لیکن واضح آواز سنائی دی: سر! میں آپ کے لیے اجنبی ہوں، لیکن مجھ پر آپ کا ایک قرض ہے اس کی ادائی چاہتی ہوں۔ وہ سانس لینے کے لیے رکی: قرض؟ میں کچھ سمجھا نہیں... اس نے نرمی سے میری بات کاٹی: سر! میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے حیران سا ہو کر کہا: مگر میں نے تو بہت عرصے سے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر میں شکریہ کا مستحق ٹھہروں۔ وہ ہلکی آواز میں ہنسی لگا جیسے نقرئی گھنٹیاں بجی ہوں: سر! یہ بھی آپ کا بڑا پن ہے ابھی چند روز قبل ہی آپ نے مجھے شان دار کمپلی منٹ سے نوازا تھا۔ میرے ذہن میں کوندا سا لپکا: اچھا تو یہ آپ ہیں، بھئی آپ نے تو کمال کا کام کیا ہے، آپ بجا طور پر تحسین کی مستحق تھیں۔ وہ ذرا دیر چپکی رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر گویا ہوئی: نہیں سر، کمال کہاں، ابھی تو میں سیکھنے کے مرحلے میں ہوں، لیکن آپ نے تو حیران کر دیا۔ پینٹنگ کی پاتال سے اس کا جوہر اٹھا لائے۔ آپ آرٹ کریٹک ہیں؟ اس نے ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں: آرٹ کریٹک! نہیں بھئی میں تو مصوری کی الف بے تک سے نابلد ہوں اور رہا جوہر تو وہ تو ہر آنکھ والے کی دسترس میں ہوتا ہے۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی پھر ٹھنڈی سانس بھر کے بولی: آنکھ والے ہیں کہاں؟ یہ تو میری خوش نصیبی تھی کہ آپ نے میرے کام کو قابل توجہ سمجھا۔ میں نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا: اصل میں توجہ میں نے نہیں دی درحقیقت آپ کی تصاویر نے مجھے پکارا۔ مگر مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ نے اپنے لیے اتنے مشکل موضوع کا انتخاب کیوں کیا؟ اس نے ذرا دیر ٹھہر کر کہا: سر! میں کچھ الگ سا کام کرنا چاہتی تھی مجھے بنے بنائے سانچوں سے چڑ ہے۔ میں اپنی کھینچی ہوئی لکیر پر یقین رکھتی ہوں۔ میں نے ہنس کے کہا: اچھی بات ہے لیکن لمبی چھلانگ کے لیے بہت تیاری کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا: سر! یہ پینٹنگز اسی تیاری کا حصہ ہیں۔ پھر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا: سر! کیا میں آپ سے ملاقات کر سکتی ہوں؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا: کس سے، مجھ سے یا سر سے؟ وہ الجھ کر بولی: میں سمجھی نہیں۔ میں نے ترنت جواب دیا: دیکھو لڑکی، میں سر وغیرہ ایسے تکلفات کا عادی نہیں ہوں، دوستوں کی طرح بات کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ اُس نے جیسے سکھ کی سانس بھری: یہ تو آپ نے ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔ مجھے بھی یہ سب بھلا نہیں لگتا، لیکن آپ یہ فرمایئے ہم کب مل رہے ہیں۔ اس نے بے تکلفی سے اپنی بات مکمل کی: ملاقات؟ ہاں ہو سکتی ہے، جب تم چاہو۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا: کیا آپ کا موبائل نمبر مل سکتا ہے؟ میں نے نمبر دیا۔ اس نے کہا: آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، آج بھی آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ میں جلد رابطہ کروں گی۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔ میں نے فون رکھ کے چائے کی وہ گرما گرم پیالی اٹھالی جو میری مہربان بیگم وہاں لا کر رکھ چکی تھیں۔ انہوں نے پوچھا کون خاتون تھیں؟ میں نے چائے کا گھونٹ بھرا: ہے ایک کمال کی پینٹر۔ پھر انہیں اپنے ایگزیبیشن جانے اور اسد سے ہونے والی بحث کا سارا قصہ سنا دیا۔ انہوں نے گلہ کیا: آپ ایسے مواقعوں پر ہمیشہ مجھے بھول جاتے ہیں۔ میں مسکرایا: ہمیشہ تو نہیں ہاں کبھی کبھار مجھ سے یہ بھول ہو جاتی ہے لیکن آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔ میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا خاصی سمجھ دار اور خوش کلام لڑکی ہے اور اپنے فن پر بھی اسے بلا کا اعتماد ہے، اس سے ملاقات دل چسپ رہے گی۔ میں اپنے روزمرہ میں مشغول ہو گیا۔ ان دنوں ہم بہت سے دوست سوچ رہے تھے کہ بہت سے رائٹر مل کر ایک ایسا ناول لکھیں جس کی پہلے سے طے شدہ کوئی تھیم نہ ہو۔ ہر شخص اپنے اسٹائل میں پچھلا باب سن کر کہانی کو آگے بڑھائے۔ یہ ایک تجربہ تھا ہم نے اس کی کامیابی یا ناکامی کے حوالے سے سوچا تک نہیں تھا۔ چند باب لکھے بھی جا چکے تھے لیکن پھر بھیڑ بڑھنے لگی، میں چاہتا تھا کہ صرف اچھے لکھنے والوں کو اس پروجیکٹ میں شامل کیا جائے، مجھے مجبوراً اس معاملے سے الگ ہونا پڑا۔ میں دوبارہ سب بھول بھال کے اپنی تحریروں اور ترجموں کی طرف پلٹ آیا۔ میں اپنی مصروفیات میں مصورہ کو تقریباً فراموش کر چکا تھا کہ کئی دن بعد اچانک ایک دن میرے

موبائل کی اسکرین پر اجنبی نمبر جگمگایا۔ میں نے گومگو کی کیفیت میں ہلو کہا۔ دوسری طرف سے چہکار سنائی دی: آپ کیسے ہیں؟ مجھے لگا جیسے کانوں میں گھنٹیاں گنگنائی ہوں: میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم کہاں لاپتہ ہو گئیں تھیں؟ وہ بشاشت سے ہنسی: میں نے سوچا آپ یہ نا کہیں کہ لڑکی کو موہنہ کیا لگایا یہ تو جان کو آگئی۔ میں ہنسا: تم جانتی ہو بعض لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ پھر ذرا سنجیدگی اختیار کی: آئندہ ایسے فضول خیالات سے باز رہنا۔ اس نے مختصر سا قہقہہ لگایا: اچھا یہ بتایئے آج شام کوئی خاص مصروفیت تو نہیں؟ میں سوچ رہی تھی آج ملاقات کر لی جائے۔ میں نے لمحے بھر کو سوچا: ہاں، کوئی خاص کام نہیں ہے ملاقات ممکن ہے، مگر کہاں اور کب؟ اس نے جھٹ سے جواب دیا: یہ فیصلہ تو آپ کریں گے، مگر ٹھہریں آپ کی رہائش کہاں ہے؟ وہیں کہیں قریب مل لیتے ہیں۔ میں خوش دلی سے بولا: گلستان جوہر میں رہتا ہوں، اچھا یہ بتاؤ فاریہ دیکھا ہے؟ اس نے چٹکی بجائی: یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا، فاریہ مجھے بھی سوٹ کرتا ہے لیکن آپ آئیں گے کیسے؟ میں زور سے ہنس پڑا: دوڑتا ہوا، ارے لڑکی ٹیکسی سے اور کس طرح۔ وہ فوراً بولی: کیوں ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے، میں آپ کو پک کر لوں گی۔ مجھے یہ پیش کش بہت بھلی لگی: یہ تو اور اچھا ہوگا، فاریہ پہنچنے تک ہم دوست بن جائیں گے۔ اس نے بناوٹی افسردگی سے کہا: کیا یہ رسم ابھی باقی ہے، میں تو سمجھی تھی ہم دوست بن چکے ہیں۔ میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا: ارے پگلی! مذاق کو بھی نہیں سمجھتیں، اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاس گاڑی کون سی ہے، اس کا رنگ وغیرہ۔ اس نے کھی کھی کی: بلو آلٹو، لباس کا رنگ لائٹ پنک ویسے میں آپ کے اسکوائر کے گیٹ کے سامنے سڑک پر ہوں گی، ٹھیک ساڑھے سات بجے۔ میں نے جواباً کہا: ڈن، میں آجاؤں گا مگر زیادہ انتظار مت کروانا۔ وہ گنگنائی: ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا۔ ok then see you. bye bye اور فون کھٹ سے بند۔ میں اس کے چلبلے پن پر مسکرایا پھر دھیرے سے اس کی بات دہرائی: ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا، لیکن کون جانے کبھی آ ہی جائے۔ مجھے اپنی اس آوارہ خیالی پر شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا یہ لڑکیاں بھی اپنی بنت میں کسی پہیلی کی طرح پیچیدہ اور گنجلک ہوتی ہیں، ان کا انفرادی بھید جو کہیں ان کے اندرون میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے پانے کے لیے ان کے باطن میں اترنا پڑتا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ اپنا آپ بھول بھلیوں کے سپرد کر دیں اور میں اس کے لیے کمر کس چکا تھا۔ انسانوں کے باطن کا ایسا ہر سفر میرے لیے ہمیشہ تحیر خیز تجربہ ثابت ہوا ہے۔ میں ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ بیوی کی آواز سنائی دی: سمجھ میں نہیں آتا آج کیا پکاؤں، میں ہر روز کے اس سوال سے زچ آچکی ہوں۔ میں نے خالی نظروں سے انہیں دیکھا: اپنی پسند کی کوئی بھی چیز پکالیں۔ وہ چونک کے بولیں: کیوں، اور آپ؟ میں نے آہستہ سے کہا: مجھے مصورہ نے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ وہ مسکرائیں: مصورہ! اچھا، لیکن کیا یہ سب کچھ بہت تیزی سے نہیں ہو رہا؟۔ پھر ذرا ٹھہر کے بولیں: ٹھیک ہے پھر کیا پکانا، میں تو کچھ بھی کھا لوں گی۔ میں نے خاموشی سے کتاب اٹھا کر مطالعہ شروع کر دیا۔ مقررہ وقت پر سیڑھیاں اترتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ میری بیوی بھی عجب عورت ہے۔ وہ کہتی ہے کبوتر دن بھر جہاں چاہے اڑتا پھرے اس کی رات اپنی چھتری پر ہی گزرتی ہے۔ میں نے کئی بار مذاق میں کہا بھی کہ کبھی اونچی اڑان کے شوق میں وہ راستہ بھی بھول سکتا ہے لیکن میری یہ بات وہ ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی ہیں۔ میری ذات پر ان کا یہ بے پایاں اعتماد میرے لیے ہمیشہ نہایت طمانیت کا باعث بنتا ہے۔ میں اسکوائر کے دروازہ سے نکلا تو نیلی آلٹو سامنے ہی کھڑی تھی۔ دو روشن سیاہ آنکھوں نے غور سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا، جانے کیسے وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر اس باوقار اور بااعتماد لڑکی نے اتر کر میرے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے ہونٹ باریک سی خیر مقدمی مسکراہٹ سے اور بھی بھلے لگ رہے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے متانت سے پوچھا: آپ کیسے ہیں؟ میں نے اس سانولی سلونی کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا: میں اچھا ہوں، تم سناؤ؟ وہ مسکرائی: اس وقت میں بہت خوش ہوں، مگر آپ کو میرا مذاق گراں تو نہیں گزرا؟ وہ بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ دھیمے انداز میں گفتگو کر رہی تھی: مذاق؟ کیا مطلب؟ میں نے جان بوجھ کر بے خبری کا تاثر دیا: اللہ حافظ کہنے سے قبل کا میرا آخری جملہ۔ اس نے آنکھیں چمکائیں: اچھا وہ، نہیں بھئی، دوستوں میں تو یہ سب چلتا رہتا ہے پُرکشش آنکھوں والی لڑکی نے چھوٹے چھوٹے پھولوں والی ہلکے گلابی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی، بالوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی لیکن لگتا تھا چہرے پر کچھ محنت کی گئی ہے۔ اس نے سرسری لہجے میں سوال کیا: اسد آپ کے دوست ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا: اسد، وہی باصلاحیت پینٹر نا! جو اس گیلری کا پارٹنر ہے جہاں وہ گروپ ایگزیبشن ہوئی تھی۔ ہاں، وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس نے تولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا: اچھا، وہ بھی آپ سے بہت متاثر ہیں، اکثر آپ کا تذکرہ کرتے ہیں، انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی: آپ دوستی کے لیے

نوجوانوں کو ہی ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا: تاکہ ان سے کچھ نیا سیکھ سکوں، بھئی تم لوگوں کے تجربات بہت تازہ، انوکھے اور دل چسپ ہوتے ہیں۔اس نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا: پلیز! مجھے نوجوانوں میں شمار نہ کریں میں جوانی کے بھی کئی برس بتا چکی ہوں۔ پھر سوال کیا: آپ پینٹر ہیں؟ میں مسکرایا: مجھے نہیں معلوم کہ لوگ اسے تسلیم کرتے ہیں یا نہیں، لیکن ہاں، میں خود کو ایک مصور ہی سمجھتا ہوں۔بس فرق اتنا ہے کہ تم اپنی تخلیقات میں رنگ استعمال کرتی ہو اور میں الفاظ سے تصویر کشی کرتا ہوں۔اس نے گنگنانے کے انداز میں کہا: very intresting اسد آپ کے کام کے بڑے قدردان ہیں۔ سنا، آپ کی کتاب بھی آچکی ہے اور آپ کا بنیادی موضوع انسان ہے؟ اس نے تیزی سے ایک ساتھ کئی باتیں کر ڈالیں۔اس دوران وہ ان فون کالز کو بھی نمٹاتی رہی تھی جو تواتر سے اس کے موبائل کو مصروف رکھے ہوئے تھیں۔میں نے ذرا ہلکے پھلکے لہجے میں کہا: فون کالز کے تانتے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے دوستوں کا سرکل بہت وسیع ہے۔میری بات پر اس نے سوچتی ہوئی آواز میں کہا: دوست! وہ تو خیر گنے چنے ہیں، ہاں ایک بھیڑ ضرور ہے۔ اسے میری کمزوری کہہ لیں لیکن مجھ سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔میں نے دیکھا جب وہ سوچتی ہے تو اس کی آنکھیں روشنی سے جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہیں۔مجھ سے رہا نہ گیا: سنو لڑکی، تمہاری شخصیت میں بلا کا توازن ہے اور شاید تم چہرہ بدلنے پر بھی قدرت نہیں رکھتیں۔ وہ کھل کھلا کے ہنسی: مجبوری ہے، کیا کروں برسوں سے اسی روکھے پھیکے چہرے سے کام چلا رہی ہوں۔ہم فار یہ پہنچ چکے تھے اس نے گاڑی پارک کی اور ہم اوپر ڈائننگ ہال میں جا بیٹھے وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے، ہم نے بھی ایک میز سنبھال لی۔اس نے اچانک کہا: میں آپ کی کتاب پڑھنا چاہتی ہوں۔اسد کہہ رہے تھے آپ آدمی کے باطن میں اتر جاتے ہیں۔میں رسانیت سے مسکرا کے بولا: کتاب تو ڈھونڈنی پڑے گی، جہاں تک انسان میں اترنے کی بات ہے تو ہاں کوشش کرتا ہوں مگر یہ بہت مشکل بات ہے یار، کون آپ کے لیے اپنے دروازے وا کرتا ہے۔اس نے اثبات میں سر ہلایا: لیکن سنا ہے آپ اس فن میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا: نہیں جناب مجھے ایسا کوئی دعوا نہیں، ہاں اب تک اپنی کوششوں میں کام یاب رہا ہوں۔ مجھے چھوڑو، اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: میں ایک عام سی بے وقوف لڑکی ہوں۔ تعلیم مکمل کی اور برش سنبھال لیا، پہلے پہل یہ مشغلہ تھا اور اب یہی روزگار ہے، مجھے جنون کی حد تک اپنے کام سے عشق ہے۔میں غور سے اس کی گفتگو سن رہا تھا اچانک اس نے کہا: اور ہاں مجھے اپنی شخصیت کے معمولی پن کا پورا ادراک ہے۔آپ نے جس توازن کا تذکرہ کیا، وہ میں نے بڑی محنت سے اپنی ذات میں پیدا کیا ہے۔میں واقف ہوں کہ اگر آپ دوسروں پر آسان ہو جائیں تو بھیڑیے آپ کو بھنبھوڑنے میں ذرا تساہل سے کام نہیں لیتے۔اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا کھرا پن تھا، ورنہ عام طور پر میں ایک بے نیاز لڑکی ہوں، میرے نفع نقصان کے پیمانے مختلف ہیں۔رسک لینا پسند کرتی ہوں، لیکن مجھے آسانی سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔شاید یہ بڑا دعوا ہے لیکن اگر آپ آنکھیں کھلی رکھیں تو یہ ممکن ہے۔اس نے گلاس بھر کے پانی پیا، ویٹر کھانا سرو کر رہا تھا۔میں آنکھیں بند کر کے کشادگی سے مسکرایا، اس نے ڈش میری طرف بڑھاتے ہوئے تیزی سے سوال کیا: آپ کی اس مسکراہٹ کا کیا مطلب لیا جائے؟ میں نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا: اسد نے شاید تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں ایسا نظر ضرور آتا ہوں لیکن غبی ہرگز نہیں ہوں۔اس نے چونک کر پوچھا: مطلب؟ میں نے ایسا تاثر کب دیا؟ میں نے غور سے اسے دیکھا: تم اتنی احمق نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو، اگر یہ انکسار ہے تو لائق تحسین ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر تم مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو۔اس نے ذرا چڑ کر کہا: آپ اتنی الجھی ہوئی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ میں خاموشی سے نوالہ چباتا رہا پھر پانی پیا۔اس نے جھلا کے کہا: آپ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ میں مسکرایا: کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے؟ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں: نہیں، لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟ میں نے جواب میں الٹا اس سے پوچھ لیا: تم خواب دیکھتی ہو؟ اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا: نہیں، میں خواب نہیں دیکھتی، مگر اس سے میرے سوال کا کیا تعلق؟ میں نے سالن لیتے ہوئے کہا: کیا واقعی تم میری رائے جاننے میں دل چسپی رکھتی ہو؟ تمہیں اسد نے بتایا نہیں میں کتنا کڑوا آدمی ہوں۔اس نے فوراً جواب دیا: مجھے لگتا ہے آپ میری باتوں سے اتفاق نہیں رکھتے۔اس ذہین لڑکی نے آدھی بات سے پورا مدعا جان لیا تھا: ہاں، کیوں کہ تم نے اپنے حوالے سے جو کچھ کہا اس میں کافی تضادات موجود ہیں۔تم کہتی ہو کہ تم ایک عام سی لڑکی ہو اور کام کچھ الگ سا کرنا چاہتی ہو۔تمہارا کہنا ہے کہ تم بے وقوف ہو اسی کے ساتھ کہتی ہو کہ مجھے کوئی دھوکا نہیں دے سکتا۔چلو ٹھیک ہے مان لیتے ہیں کہ اپنی شخصیت میں یہ توازن تم نے خود پیدا کیا ہے، تو کیا یہ کسی عام انسان کے بس کی بات ہے؟ رہی تمہاری شخصیت کے معمولی پن کی بات تو وہ لوگ

جو بڑے کام کا ارادہ باندھ لیں ان کے لیے ظاہری دل کشی وغیرہ بے معنی باتیں ہو جاتی ہیں، مجھے تعجب ہے تم نے اس کا خصوصیت سے تذکرہ کیا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ تمہارا کہنا ہے کہ تم خواب نہیں دیکھتیں، اگر یہ سچ ہے تو پھر تم لوگوں میں بانٹنے کے لیے یہ خواب کہاں سے لاتی ہو؟ اس نے چمکتی ہوئی آواز میں اعتراض کیا: آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں لوگوں میں خواب بانٹتی ہوں؟ میں نے کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر اطمینان سے کہا: ابھی تم نے ایک بھیڑ کا تذکرہ کیا تھا، یہ کون لوگ ہیں؟ اور انہیں کس چیز نے تم سے باندھ رکھا ہے؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک خواب ہے جو دانستہ یا نادانستہ تم نے انہیں تھمایا ہے۔ اس نے بوتل رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا: مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے لیکن آپ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ میں تلخی سے ہنسا: تمہیں برا لگا ناں، میں اسی لیے بات کو طرح دے رہا تھا لیکن تم ضد پر اتر آئیں۔ میں سچ بولنے کی کوشش کرتا ہوں جو میرے ذہن میں ہوتا ہے وہی زبان پر لے آتا ہوں اور لوگ روٹھ جاتے ہیں میں اپنی اس عادت کے باعث کتنے ہی دوستوں سے محروم ہو چکا ہوں، چلو آج ایک اور سہی۔ وہ کچھ آزردہ سی ہو کر گویا ہوئی: ارے، آپ سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے آپ کی باتیں بری لگیں، میں نے تو آپ کی تردید تک نہیں کی محض عدم اتفاق کا اظہار کیا، ممکن ہے اگلی بار میں آپ سے متفق ہو جاؤں۔ بھئی کچھ وقت تو دیجئے ناں۔ میں نے میز کی سطح پر انگلیاں تھپتھپائیں۔، وہ بولی: لگتا ہے آپ کو میری باتوں سے مایوسی ہوئی۔ میں نے سادہ لہجے میں کہا: نہیں، لیکن یہ ہمارا اجتماعی رویہ ہے کہ ہم دوسروں کے بارے میں کہے اور لکھے ہوئے سچ کو خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں لیکن اگر کوئی ہماری سچائی زیر بحث لے آئے تو بکھر جاتے ہیں۔ اس نے رسانیت سے میری بات کی تردید کی: میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے، اس کی وجہ کچھ اور ہے، ٹھیک ہے میں ڈراما کرتی ہوں دراصل میں خود کو ڈھکا چھپا رکھنا چاہتی ہوں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ میں خواب واقعی نہیں دیکھتی۔ مجھے لگا وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی: اچھا یہ بتاؤ abstract art کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟ اس نے ذرا سوچا پھر نارمل انداز میں بولی: Abstract paint کرنے کے لیے تو بڑا وژن اور مہارت درکار ہوتی ہے اگر کوئی ایسا باکمال ہو بھی تو پوچھتا کون ہے، یہاں تو ابھی Realistic Art کو سمجھنے اور سراہنے والے بہت کم ہیں۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا: تو پھر تم کس کے لیے مصوری کا نیا رجحان متعارف کرانے کی تگ و دو میں ہو؟ اس کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے: بھئی آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔ آرٹ کریٹکس میرا پورا کام دیکھنے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر رہے اور آپ.... میں نے بات قطع کی ارے یار میرے قصیدے جانے دو۔ مجھے میرے سوال کا جواب دو۔ وہ جھٹ سے بولی: فن کسی سرحد کا پابند تو نہیں ہوتا، ذرا ڈھنگ کا کچھ کام کر لوں تو اس کے قدردان بھی مل جائیں گے، اب تو دنیا بہت سکڑ گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے میری وہ پینٹنگز جو آپ نے پسند کی تھیں انہیں ایک غیر ملکی نے خرید لیا۔ دیکھئے اصل ماجرا تو میری اپنی آسودگی کا ہے۔ میں نے مسکرا کے چوٹ کی: اب تم دیکھ لو تم خود اپنی باتوں سے میری تلخ نوائی کی تصدیق کر رہی ہو۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی: میں نے کب کہا کہ آپ کی بات درست نہیں۔ اصل میں مجھے دوستوں کی توقعات سے خوف آتا ہے، میں سوچتی ہو اگر میں وہ سب نہ کر سکی جس کی انہیں مجھ سے توقع ہے تو وہ کتنے مایوس ہوں گے۔ پھر ذرا ناراضگی سے بولی: اور آپ نے دوستی کے خاتمے کا اعلان کیوں کیا؟ میں ہنسا: تو تمہیں اس کی پروا ہے۔ اصل میں اب تک دوسرے اس قسم کے اعلانات کرتے رہے ہیں، اس بار میں نے سوچا کہ میں خود یہ کر گزروں۔ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھا۔ مجھے لگا جیسے ایک مقناطیسی لہر نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ دھیمے سے بولی: آئندہ ایسی بات مت کیجئے گا، مشکل سے تو آنکھ والا میسر آیا ہے اور آپ اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ اس کے لہجے میں عجب لگاوٹ تھی۔ ہوٹل کے بل وغیرہ سے نمٹ کے ہم گاڑی میں آبیٹھے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو میں نے اسے چھیڑا: کہو! ایک کڑوے آدمی کے ساتھ شام کیسی گزری؟ وہ ہنسی پھر کہا: بہت مدت بعد کسی کے ساتھ وقت گزار کر خوشی کا احساس ہوا اور بات اگر کڑواہٹ کی ہے تو اس میں تو کچھ ایسا ذائقہ تھا کہ بار بار چکھنے کو جی چاہے۔ میں نے پوچھا: کیا خیال ہے چائے ہو جائے۔ اس نے بڑی مسرت سے کہا: اوہ! یس، مگر کہاں؟ میں بولا: بس سیدھی چلتی رہو آگے پٹھان ہوٹل ہے۔ مجھے گھر پر اتارتے ہوئے اس نے کہا: اب میں اکثر فون پر آپ کو پریشان کرتی رہوں گی۔ پھر کچھ جھجک کے پوچھا: آپ کی مسز کو تو اعتراض نہیں ہوگا؟ میں نے رک کر کہا: کیوں بھئی اس میں اعتراض کی کیا بات ہے بلکہ کبھی تم گھر آؤ۔ وہ بہت مہربان خاتون ہیں تمہیں ان سے مل کر خوشی ہوگی۔ وہ مسکرائی: ضرور، ویسے وہ بہت خوش نصیب ہیں۔ میرے ذہن میں اس کے مکالمے جیسے دائروں میں ڈول رہے تھے، میں نے سوچا۔ وہ ایک حساس فن کارہ ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی نیند خوابوں سے محروم

رہتی ہو۔ خواب تو اُس کی آنکھوں سے چھلکے پڑتے ہیں لیکن شاید کسی حد تک وہ سچ ہی کہتی ہے، ممکن ہے اب تک اس نے وہ خواب دیکھا ہی نہ ہو جسے دیکھنے کی وہ تمنائی ہے اور وہ خواب، جو اس کی حسین آنکھوں میں در آتے ہوں گے انہیں وہ خواب کا درجہ دینے پر آمادہ ہی نہیں۔ ان میں سے کچھ خواب وہ خود پینٹ کر لیتی ہے اور باقی ان لوگوں میں تقسیم کر دیتی ہے جو ان کے امیدوار ہوتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے رویے میں کتنا منفرد ہوتا ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو میری خاتون خانہ حسب معمول میرے انتظار میں سوکھ رہی تھیں۔ میں لباس وغیرہ تبدیل کر چکا تو وہ میرے لیے چائے لے آئیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ملاقات کا احوال الف سے ے تک سننا چاہتی ہیں۔ میں نے پوری تفصیل کے ساتھ انہیں سب کچھ سنا ڈالا۔ انہوں نے برملا کہا: اچھی لڑکی ہے اور آپ کی قدر کرتی ہے، مجھے اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ اب رات خاصی ہو چکی تھی ہم نے بستر سنبھالا اور خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔ اب ہم آئے دن فون پر بات کرتے۔ وہ ایک روشن خیال لڑکی تھی میں اس سے ہر موضوع پر سہولت سے بات کرتا۔ وقت کے ساتھ میرے لیے اس کی کشش اور پسندیدگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم دوست تھے لیکن شاید اب دوستی کا لفظ اس تعلق کی مناسب ترجمانی کے لیے ناکافی تھا۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی ہم کسی سے اس سطح پر تعلق استوار کر لیتے ہیں جہاں صنف کی اہمیت نہیں رہ جاتی بلکہ یہاں تک کہ جیسے دو نفوس آپس میں حلول کر گئے ہوں۔ ہمارے درمیان کچھ ہے جسے میں پوری معنویت کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن یقیناً، یہ جو کچھ بھی ہے اور چاہے اسے کوئی بھی نام دیا جائے وہ کچھ مختلف سا ہے۔ اس کی پینٹنگز میں جو چیز مجھے حیران کرتی ہے وہ موضوع کا تنوع اور رنگوں کے امتزاج کے علاوہ برش کا ماہرانہ استعمال ہے، کم لکیروں میں پوری بات کہہ دینا بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتی ہے۔ دھان پان سی یہ تمکین لڑکی اپنے اندر کوئی طلسم رکھتی ہے۔ اسے دور سے دیکھئے تو اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ آپ ششدر رہ جائیں۔ دراصل وہ چنگھاڑتے ہوئی دل کشی کی مالک نہیں، اس کی مثال تو اس نظم جیسی ہے جو اپنا حسن اور معنویت دھیرے دھیرے آپ پر منکشف کرتی ہے۔ آپ جیسے جیسے اس سے فاصلہ کم کرتے جاتے ہیں اس کے وصف آپ پر کھلتے جاتے ہیں اور اگر آپ حسن پرکھنے اور سراہنے والی آنکھ سے نوازے گئے ہیں تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی جاذبیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آپ اپنی یہ کیفیت اس سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتے کیوں کہ اس کی آنکھیں پرکشش ہی نہیں بے حد چوکس بھی ہیں۔ اُس کے لیے کسی کو اس کیفیت میں دیکھنا کوئی بڑے اچنبھے کی بات نہیں، کیونکہ ایسے نظارے تو وہ آئے دن دیکھنے کی عادی ہے۔ اس کے باریک سے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھلتی ہے اور وہ بے نیازی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ کسی عام سی لڑکی کا نہیں بلکہ ایک منفرد اور باصلاحیت انسان کا ردعمل ہے جو واقف ہے کہ کس جوتے کو کس پیر میں جگہ دینی چاہیے اور کسے نظر انداز کر کے بے نیازی سے آگے بڑھ جانا چاہیے۔ ایک پینٹر کی حیثیت سے کراچی سے دہلی بلکہ اس سے بھی دور دور تک اس کی دھوم ہے۔ ہر ہوش مند فن کار کی طرح وہ بھی رنگ کاری کے ہوکے میں مبتلا نہیں لیکن جب وہ پینٹ کرتی ہے تو اس کی تخلیق شہر کے چائے خانوں میں فن کے بخیے ادھیڑنے والوں کا خاص موضوع بن جاتی ہے۔ وہ اپنے رویے میں کھلے ذہن کا مظاہرہ کرتی ہے مگر ناپ تول کر گفتگو کرنے کی عادی ہے، اسے ایسے لوگ اچھے تو نہیں لگتے جو اپنے قصیدے پڑھنے کے عادی ہوں لیکن وہ ان سے خوش ادائی سے بات کرتی ہے یہ الگ بات کہ اس دوران اس کے دونوں کان نہایت مصروف رہتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں آدمی کو اوپر سے اندر تک دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور پھر انسان جس طاقچے کا مستحق ہوتا ہے اسے وہاں سجا دیتی ہے۔ اپنی ذات سے بے نیازی اور بے پروائی کو اس کی ایک خصوصیت جانئے لیکن میں شروع شروع میں اس کی اس ادا پر خاصا شاکی رہا۔ یہ تو بہت بعد کو جا کر میری سمجھ میں آیا کہ جو اندر سے بھرا پرا ہو وہ اگر اپنے ظاہر پر زیادہ توجہ نہ بھی دے تو کوئی حرج نہیں۔ وہ اپنے لباس کا خیال تو شاید رکھتی ہے لیکن اسے اس کی ہرگز پروا نہیں کہ وہ کیسی دکھائی دیتی ہے اور اسے اس کی فکر بھی کیوں ہو، اس کے لیے اس کی بے پناہ ذہانت اور اپنے فن پر مکمل دسترس ہی بہت کافی ہے۔ میں اس کی خود اعتمادی دیکھ کر ڈر جاتا ہوں کیوں کی حد سے بڑھا ہوا اعتماد انسان کو کسی خسارے سے بھی دوچار کر سکتا ہے۔ مگر وہ کہہ چکی تھی کہ اس کے نفع اور نقصان کے پیمانے الگ ہیں۔ ممکن ہے جسے میں خسارہ کہہ رہا ہوں وہی اس کے لیے کامیابی کی نوید ہو۔ حساس لوگوں کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی کو افسردہ نہیں دیکھ سکتے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو گھنٹوں اُسے فون پر مصروف رکھتے ہیں، وہ بھی ان سے خوش دلی سے باتیں کیے جاتی ہے۔ لیکن مجھے گمان سا ہے جیسے اپنی اس مصروفیت کے دوران اس کے ذہن میں اپنے کسی شہکار کا کوئی کردار ہوتا ہے، جس کے موڈ، رنگوں کے امتزاج اور اسٹائل کے

چناؤ کے لیے وہ ان طول طویل مکالموں سے مدد لیتی ہے۔اصل میں اس کی بے پناہ ذہانت کسی کو بھی اپنا اسیر بنانے کی اہلیت رکھتی ہے اور اگر اس کا ہدف ذہنی بلاغت کا مالک بھی ہو تو جانئے ان دونوں کی لاٹری نکل آتی ہے۔ایسے مکالموں سے کئی شگوفے پھوٹتے ہیں اور کورے کاغذوں پر خوب برگ و بار لاتے ہیں۔ایک دن دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں وہ کھڑی تھی۔اس نے سنجیدگی اور متانت سے پوچھا: آپ کی مسز سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ میں مسکرایا: جی کیوں نہیں،اندر آیئے۔میری بیوی نسوانی آواز سن کر دروازے پر پہنچ چکی تھیں۔انہوں نے نہایت والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔وہ دونوں جلد ہی پرانی شناساؤں کی طرح گفتگو کرنے لگیں، مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔میں نے مناسب سمجھا کہ الگ تھلگ ہو جاؤں مگر کہاں... جلد ہی بیگم آدھمکیں: یہ کیا روکھا پن ہے۔لڑکی کیا سوچے گی ہم کتنے بد اخلاق لوگ ہیں۔میں چپ چاپ ان کے ساتھ ہولیا۔ڈرائنگ روم میں وہ ایسی بے فکری سے بیٹھی تھی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔میری بیوی نے صفائی پیش کی: انہوں نے سوچا کہ شاید یہ ہماری گفتگو میں مخل ہو رہے ہیں۔وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مہذب انداز میں بولی: جی، میں گزشتہ چند ماہ میں انہیں خاصا جان گئی ہوں، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی: آپ کی مسز تو آپ سے بھی زیادہ محبت کرنے والی ہیں۔اب وہ میری بیوی سے مخاطب تھی: آپ جس قدر خوش اخلاق اور فراخ دل ہیں اسی قدر اچھے مقدر سے بھی نوازی گئی ہیں۔میری بیوی نے مجھ پر محبت کی نظر ڈالی: بلاشبہ یہ بہت اچھے دوست اور خیال رکھنے والے انسان ہیں۔یہ ملاقات کافی دیر جاری رہی اور اس دوران وہ بلا جھجک بہت سلیقے سے محو کلام رہی۔وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ ہماری دوستی کے دن، برس میں بدل گئے۔آج وہی تاریخ تھی جب ہم پہلی بار ملے تھے۔میرے ذہن میں وہ ملاقاتیں کسی فلم کی صورت گردش کر رہی تھیں کہ اچانک فون کی گھنٹی نے میرے تصور کو بکھیر دیا۔: ہلو، کیسے مزاج ہیں جناب؟ اس کی شوخ آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔: ہاں ، بہت اچھے تم سناؤ؟ اس نے ذرا ٹھہر کے کہا: آج بہت خاص دن ہے۔میں نے ان جان بن کر پوچھا: اچھا، بھلا کیسے؟ ایک چہکار سنائی دی: صاحب، آج ہی کے دن ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔اب میں کیا کہہ سکتا تھا: واہ، اتنی جلد سال گزر گیا۔تو پھر کیا پروگرام ہے؟ وہ بڑے جوش سے گویا ہوئی: پروگرام تو آپ ہی فائنل کرتے ہیں۔میں نے سوچنے میں کچھ وقت لینے کے بعد تجویز پیش کی: ایک لمبی ڈرائیو کے بارے میں کیا خیال ہے۔

اس نے خوش ہو کر کہا: بہت عمدہ آئیڈیا ہے پھر وہیں ہائی وے پر کہیں ڈنر کریں گے، بڑا لطف رہے گا۔ہم نے وقت طے کیا۔اسی ملاقات کے دوران میں نے ایک موقع پر سوال کیا: آج کل اسد سے کچھ ان بن ہے کیا؟ اس نے سوچتی ہوئی آواز میں کہا: اسد،نہیں ، ان بن کیا ہونی ہے،وہ تو بدرنگ ہو چکے جیسے کورا کاغذ... میں نے بات بیچ سے ہی اچک لی: بدرنگ؟ کورا کاغذ؟ کیا کہہ رہی ہو؟ اس نے افسردگی سے کہا: انہوں نے مجھے نہایت مایوس کیا ہے۔اب اسے ٹوکنا ضروری تھا: تمہیں اپنے سنیئر کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہیے۔اس نے نفی میں سر ہلایا: بات یہ نہیں ہے،اب جیسے وہ آدمی رہا ہی نہیں جس کی انفرادیت اور مشاقی کی میں قائل تھی۔اب میں ان کی کلر اسکیم اور اسٹروکس کی یکسانیت سے اکتا چکی ہوں۔انہیں برش رکھ دینا چاہیے مگر وہ ہیں کہ خود کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں ایک لمبے عرصے تک آرام کرنا چاہیے، تاکہ نئے تجربات سے توانائی کشید کر کے برش استعمال کرنے کے قابل ہوسکیں۔مجھے لگتا ہے ان کے پرانے اچھے کام کی تکرار انہیں نگل رہی ہے۔ وہ بہت افسردہ لگ رہی تھی: چلو چھوڑو ، میں بھی کیا ذکر لے بیٹھا۔ یہ بتاؤ تمہاری سولو ایگزی بیشن کی تیاری کیسی ہے؟ اس نے کھٹ سے کہا: سب تیار ہے بس کسی فیتہ کاٹنے والے کی تلاش ہے۔پھر خوش دلی سے ٹھٹا لگایا: نہیں، آپ جانتے ہیں میں یہ سب نہیں کرتی۔بس کچھ پینٹنگز پر کام باقی ہے۔وہ فائنل ہو جائیں تو ڈیٹ کا اعلان کر دیں گے۔اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا دنیا جہاں کی باتیں کیں اور پھر واپس آ گئے۔لگتا تھا وقت، جیسے آواز کی رفتار سے دوڑا جاتا ہو۔اس بیچ ہمارے درمیان کتنی ہی بار دوستی کا دن مبارک ہو اور دیگر مبارک بادوں کا تبادلہ ہوا۔لیکن اس صبح میں پہلی بار یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا؟ گزشتہ رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور سیانے کہتے ہیں کہ جب کوئی لڑکی کسی کی نیندیں رنگین کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اب واپسی کی ہر راہ مسدود ہو چکی ہے۔تو اب میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنا خواب کس سے شیئر کروں۔ میں نے ہڑبڑا کر اسی کے نمبر ڈائل کر دیے۔وہ جیسے میری کال ہی کی منتظر تھی: کیسی عجب بات ہے میں آپ سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ آپ کی کال آ گئی۔میں بجھے سے لہجے میں بولا:: میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے اس سے زیادہ عجیب بات ہے۔وہ بڑے اشتیاق سے بولی: تو بتایئے ناں۔میں سپاٹ سی آواز میں گویا ہوا: گزشتہ شب میں نے ایک خواب دیکھا... اس نے بات کاٹتے ہوئے چونک کر

پوچھا: خواب، آپ نے۔ جانے کیوں میں جھنجلا گیا۔ کیوں، میں خواب نہیں دیکھ سکتا؟ وہ گڑبڑا گئی: نہیں، میرا مطلب تھا کہ... خیر چھوڑیئے، آپ فرمایئے آپ نے کیا دیکھا؟ میں نے غنودہ سی آواز میں کہا: میں نے دیکھا کہ میں اور تم سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ یکا یک سمندر تیز ہوجاتا ہے جیسے اس میں بھونچال آگیا ہو۔ اس کی لہروں کا اچھال کئی کئی فٹ بلند ہوجاتا ہے اور جب وہ گرتی ہیں تو ان کے گرنے سے ایک پُرشور موسیقی سی جنم لے رہی ہے۔ تم سہم کے پوچھتی ہو: یہ سمندر جلال میں کیوں ہے؟ میں نفی میں گردن ہلاتا ہوں: سنو، وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ تم خوش ہوکر کہتی ہو: ارے ہاں، یہ تو خیر مقدمی گیت سا ہے۔ میں غور سے سنتے ہوئے کہتا ہوں: وہ کہہ رہا ہے اجلی روحوں، آؤ، میرے نزدیک آؤ تاکہ میں تمہیں خود میں سمیٹ سکوں۔ اب سمندر پُرسکون ہوچکا ہے۔ میں اٹھ کر بازو سے تمہیں تھامتا ہوں اور ہم گیلی ریت پر اپنے نقش ثبت کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ اچانک زمین ہمارے قدموں سے نکل جاتی ہے۔ یہاں میری آنکھ کھل گئی۔ وہ سوچتی ہوئی آواز میں بولی: یہ تو بڑی کھلی بشارت ہے۔ آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ پھر ذرا دیر ٹھہر کے بولی: تو چلیے ناں کسی دن سمندر سے ملاقات کر آتے ہیں۔ میں نے عالم حیرانی میں اس کی بات سنی: بشارت؟ کیسی بشارت؟ اور اگر اس نے واقعی ہمیں سمیٹ لیا؟ اس نے بڑے تیقن سے رس گھلی آواز میں کہا: نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ تو ہمارا دوست ہے آپ نے دیکھا نہیں اس نے ملاپ کا کیسا واضح اشارہ دیا ہے۔ میں تو بے حد خوش ہوں۔ اس کے سمندر چلنے کے اصرار کو میں ٹال گیا۔ اس سے بات کرکے میری بے چینی میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میری بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے کئی روز سے مجھ پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بے چین دیکھ کر بولیں: کس چکر میں ہیں؟ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے کی طرح گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: نہیں... کچھ بھی نہیں، بس یونہی۔ وہ مسکرائیں: لیجیے جیسے ہم انہیں جانتے ہی نہیں اور بات چھپانے کا یہ کیسا بھونڈا انداز ہے؟ میں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ انہوں نے کہا: لگتا ہے اس بار آپ نے واقعی لمبی اڑان کا ارادہ باندھ لیا ہے۔ بس ذرا عمر کا دھیان رکھیے گا۔ میں نے تیزی سے کہا: کیوں کیا اس عمر میں میری ہر خوشی، ہر چاہت اور تمام حقوق پر خط تنسیخ پھیرا جاچکا ہے؟ انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا: کون کہتا ہے بالکل نہیں، ہم تو بس اتنا کہہ رہے ہیں یہ دیکھیں لوگ کیا کہیں گے۔ میں بپھر گیا: کون لوگ، کس کی بات کر رہی ہیں، ان کی جنہوں نے کبھی پلٹ کر میری خبر تک نہیں لی۔ نہیں، مجھے ان کی یا کسی بھی اور کی کوئی پروا نہیں ہے میرے جارحانہ انداز پر وہ حیران رہ گئیں:

ارے، آپ تو جذباتی ہوگئے۔ چلیے ٹھیک ہے، میری توبہ جو آئندہ میں ایک لفظ کہوں۔ میں نے ذرا نرم لہجہ اختیار کیا: آپ جو چاہیں کہیں مگر مجھے بھی آزادی دیں کہ میں جو چاہوں کرتا پھروں۔ وہ تلخ ہوگئیں: آپ جانیں، ہمیں کیا۔ پھر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ میں سوچتا ہوں، ٹھیک ہے، اس نے مجھے بھی ایک خواب سونپ دیا ہے لیکن کیا محض اس لیے کہ اس کی اور میری عمر میں آدھے سے کچھ کم کا فرق ہے۔ میں اپنی خوشی، اپنی آرزو سے دست بردار ہوجاؤں؟ کیا بال پکنے کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں رہا کہ میں اپنی عزیز ترین ہستی کے ساتھ گھوموں پھروں۔ جب وہ خود اسے ملاپ کی بشارت قرار دے چکی ہے تو اب لوگ جو چاہیں کہتے پھریں۔ میں اس کی قربت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اپنی اس سوچ پر میں ہنس پڑا۔

□□□

فرہنگ آصفیہ سے

قارون۔ ع۔ اسم مذکر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چچا زاد بھائی کا نام جو نہایت خوبصورت ہونے کی وجہ سے منور کے نام سے مشہور تھا۔ قدما کے اعتقاد میں یہ سونا چاندی بناتا اور بہت بڑا کیمیا گر تھا۔ اس نے اس قدر روپیہ جمع کیا تھا کہ چالیس خچر صرف اس کے خزانوں کی کنجیوں کو لیکر چلا کرتے تھے جب حضرت موسیٰ نے حکم دیا کہ ہزار دینار پیچھے ایک دینار زکوٰۃ دیا کر تو وہ بہت ناراض ہو کر ان سے منحرف ہو گیا اور حضرت موصوف کو ذلت دینے کے درپے ہوا آخر کار اپنے افعال قبیحہ اور ان کی بد دعا سے اپنے مال اسباب سمیت زمین میں دھنستا چلا گیا اور قیامت تک اسی طرح پر خزانوں کا بوجھ لئے زمین کے اندر بیٹھتا چلا جائیگا۔ مجازاً ہر ایک بخیل مالدار کو کہتے ہیں

صائبا خجلتِ سائل بزینم در کرد
بے زری کرد بہ من آنچہ بقارون زر کرد (صائب)

عید کا دن

کوثر بیگ

ارے ! مجھے کہتے میں سہارا دیکر یہاں تک پہنچا دیا ہوتا۔۔۔

۔۔۔کہنے والا تو کہہ کر جا چکا مگر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی

'سہارا'' !! اس نے سہارے پر زور دیتے ہوئے کچھ توقف کے بعد خود سے سوال کرنے لگی۔ عورت کو سب کمزور بے سہارا کیوں سمجھتے ہیں؟ ہمیں تنکا سمجھنے والے پھر کیوں تنکوں کے بغیر نہیں رہ سکتے؟ یہاں کوئی کسی کا سہارا نہیں، ہم ایک دوسرے کے سہارے ہیں۔ ہم سب کا اصلی سہارا وہ واحد لاشریک ذات ہے جس نے یہ دنیا بسائی ہے۔۔۔۔۔

اپنے آپ کو جواب دیتے ہوئے پلنگ کے سرہانے کی جانب بیٹھکر ایک تکیہ پر دوسرا تکیہ کھڑا رکھا پھر پلٹ کر تکیہ سے پیٹھ ٹیک کر پاؤں پسار لیے پھر آہستہ سے سرکتے ہوئے نیم دراز ہوگئی اس عمل نے خیالات کو منتشر ہونے نہیں دیا۔

محمودہ بیگم حال اور ماضی کی ریگ زار کی خاک چھانتے بہت دیر تک محو پلکیں بھگوتی رہیں۔

ماضی کے دریچے وا ہو چکے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی تمام عیدین کی تصاویر لحہ لحہ تخیل کے پردہ سیمیں پر رقص کرتی رہیں۔

وہ متمول گھرانے کی فرد تھی لیکن والدین کی کفایت شعاری کے پیش رفت عیش و عشرت سے دور رہی اور نہ کبھی ایسے خواب دیکھنے کی ہمت تھی۔ والد گھر کے معاملات ماں کو سونپ کر مستقبل کی فکر میں بزنس پر پورا وقت دیا کرتے۔ ماں کھانے اور کپڑوں کے وقت تو بیٹی کو مقدم رکھتی مگر پڑھائی لکھائی ر دونوں بیٹے توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ ماں کا خیال تھا لڑکے زیادہ باہر رہتے ہیں انہیں حالات کے سرد گرم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ گھر باہر سب کچھ سنبھالنے کے قابل بنانا ہوگا۔ کچھ بننے، اپنا مقام زمانے میں قائم رکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے اسی خیال سے وہ پوری توجہ ان پر رکھتیں۔

جب بھی ماں سے مطالعہ کے دوران کچھ پوچھنا چاہتی وہ بھائیوں کی پڑھائی میں مصروف رہتی انتظار کے بعد جو بن پڑتا پڑھکر چپ چاپ اٹھ جاتی اس طرح علم حاصل کرنے میں پیچھے ہوتی چلی گئی۔ اسکول میں ٹیچرز کی ڈانٹ، سہیلیوں کے سامنے ذلت اور پڑھائی میں کمزور رہنے کے سبب بدشوق ہوگئی پھر ایک دن میٹرک میں ناکامی نے ماں کو احساس دلایا۔ ان کی کوشش کے باوجود مزید آگے پڑھ نہ سکی۔ بابا نے مشورہ دیا کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اسے امور خانہ داری اچھے سے سکھا دو آخر کو ایک دن گھر گھرستی ہی سنبھالنی ہے۔

پھر ایک دن اپنے ہی آفس کے اکاؤنٹنٹ جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس کی ایمانداری اور شرافت سے متاثر ہو کر بیٹی کے لئے بر منتخب کرلیا۔ ماں، بھائیوں نے مالی حالت کا احساس کروایا تو ہر ضرورت کی چیز خود مہیا کرنے کا بابا نے یقین دلایا۔۔ بیٹی کی خاموش سپورٹ نے بابا کو من چاہا داماد لا دیا۔ میاں کی خودداری نے جہیز لینے سے انکار کردیا۔ زندگی محبت اور سکھ چین سے گزارنے لگی۔ اللہ نے تین بیٹوں سے بھی نوازا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی بھائیوں نے بھی شادی کرلی بھابیوں

نے اپنے برابر کا نہ سمجھ کر رشتہ داری توڑ لی۔ ماں بابا بھی عمر کی زیادتی اور ماحول کے بدلاؤ سے بیمار رہنے لگے۔ بھائیاں اپنی ازدواجی زندگی میں مگن رہنے لگے تو اپنی خدمت پیش کر کے انہیں گھر لے آئی مگر انہیں زیادہ دن یہ دنیا راس نہیں آئی۔ دونوں کچھ وقت کے فرق سے دنیا سے کوچ کر گئے۔

پھر ایک منحوس دن ایسا حادثہ ہوا جس میں سہاگ بھی لٹ گیا۔ پہلے کم آمدنی کے باوجود آسانی سے گزارا ہو رہا تھا۔ واحد ذریعہ معاش ختم ہو چکا تھا۔ چالیس دن تک رشتہ داروں کی آمدورفت اور مہمانداری، بچوں کی سکول فیس کے لئے گھر کے قیمتی اشیاء فروخت کرنی پڑی کسمپرسی میں گزارا ہونے لگا۔ بھول کر بھی اب کوئی عزیز دیکھنے نہیں آرہا تھا۔

بے چینی سے کروٹ بدل کر پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی مجھے یاد ہے وہ ایسا ہی ایک عید کا دن تھا۔ حالات اس دن جیسے کبھی ابتر نہ تھے۔ ۔ کپڑے تو درکنار کھانے تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح زندگی کے اتار چڑھاؤ میں کھوئی ہوئی میں کچھ دور دولت مندوں کی رہائشی فلک بوس عمارتوں کی جانب دیکھے جا رہی تھی اس پر لگے ننھے ننھے برقی قمقمہ سجاوٹ کے لئے لگائے گئے تھے۔ جو عمارت کے ساتھ میرے بھی دل میں مدھم سی امید کی کرن روشن نظر آرہی تھی۔

پھر ایک بار اپنی عدت کے دن انگلیوں پر گن کر حساب لگائی۔ ایک روز پہلے ہی عدت کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ دو دن سے بھوکے اپنے بچوں کے لئے باہر جا کر کھانے پانی کا انتظام مجھے ہی کرنا تھا۔ میاں کی محرومی یتیم بچوں کی ذمہ داری باہر جانے کو مجبور کر رہی تھی۔ مگر زندگی کے وہ شب و روز بھی بھول نہیں پا رہی تھی جس میں پہلے باپ پھر میاں حسب استطاعت ہر نعمت گھر میں مہیا کرنے کی جستجو وسعی میں لگے رہتے۔ پیسے کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا پیسے کتنی محنت مشقت کے ساتھ آتے ہیں۔ عزت کی روٹی گھر بیٹھے مل جایا کرتی تھی۔ بچوں کو بھوک سے بے چین ہوتے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ رشتہ دار منہ موڑ چکے تھے۔ ان بچوں کا واحد سہارا میں ہی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پڑھائی اور ہنر تو کچھ سیکھا نہیں۔ کیا کرتی کچھ سمجھ نہ آیا۔ مجھ قسمت کی ماری۔ کو کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی مصمم ارادہ کر کے برقعہ اوڑھا اور بچوں کو صبر اور انتظار کی تاکید کر کے باہر رزق کی تلاش میں نکل پڑی۔۔

سڑک عبور کر کے پہلی عمارت میں داخل ہونے لگی۔ گیٹ ہی پر روک دیا گیا چوکیدار روکتے ہوئے کہنے لگا۔

اری او! کہاں گھسے چلی آتی ہے؟

میرے بچے بھوکے ہیں انہیں کچھ کھانا چاہئے میں نے لجاجت کے ساتھ کہا تھا۔

ہاں تم لوگ باتیں تو ایسے ہی کرتے ہیں چور اچکے کہیں کے چلو نکلو یہاں سے میری غیرت اتنی بے عزتی کے بعد وہاں ٹھہرنے کی اجازات نہیں دے رہی تھی پہلے تو میں نے تیز تیز قدم گھر کی جانب بڑھا دئے مگر پھر بھوکے بچوں کے خیال نے مخالف سمت واپس چلنے مجبور کر دیا۔ دوسری بلڈنگ کے بلند دروازے کے سامنے پہنچ کر اندر جھانکنے لگی تو کسی نے دیکھکر اندر سے آواز دی" ارے کون ہے تو" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا" میرے بچے دو دن سے بھوکے ہیں۔ کچھ کھانے کو ملے گا"۔ اسے ٹھیک سے بھیک مانگنا بھی نہیں آرہا تھا۔ قیمتی زیور کپڑوں سے آراستہ خاتون شاید مالکن تھی کمزور سی آواز سنکر نرم لہجہ سے وہاں بیٹھی دو عورتیں جو کام میں مصروف تھیں انہیں حکم دیا کہ آج عید کے دن کسی کو خالی ہاتھ گھر سے نہ بھیجا جائے ایک تھال کھانا کباب جو بھی بنا ہے اس غریب عورت کو نکال کر دے دو۔ یہ کہتے ہوئے ایک نگاہ ہمدردی کی دروازے کی طرف ڈالکر اندر چلی گئی۔ جیسے ہی مالکن نظروں سے اوجھل ہوئی کام میں مصروف خواتین نے اسے وہاں سے جانے کو کہہ دیا۔۔ مگر وہ مالکن نے تو کہا ہے کہ۔۔۔۔ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا۔ غصہ کے مارے وہ دونوں برس پڑی" محنت ہم کریں اور مفت میں لینے یہ آجاتے ہیں۔ 'چلو جاؤ یہاں سے مفت خور کہیں کی!

بہت دیر تک کھانے کی آس میں مالکن کی واپسی کا انتظار کرتی چپ چاپ کھڑی ان کا عتاب سنتی رہی مگر بار بار کی دھتکار نے وہاں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ در بہ در اولاد کی محبت ایک کے بعد دیگر گھر لے جا کر کھڑی کرتی رہی۔ میں تھک گئی تھی مگر ہاری نہیں تھی بچوں کے کھانے کی طلب میری ہمت بڑھا رہی تھی۔ نویں گھر کے باہر ٹھہر کر ہچکچا رہی تھی کہ کچھ لوگ اندر سے باہر آنے لگے انہیں دیکھکر گلی کی دیوار کی جانب سرک گئی۔ ایک ایک کر کے سب ہاتھ ہلاتے اپنی گاڑیوں میں بیٹھتے رہے کچھ نے اسے دیکھا بھی وہ مدد کے لئے آواز دینا چاہتی تھی مگر کبھی تیزی سے نظر انداز کرتے جاتے رہے انہیں افسردہ بت بنی بے بسی سے تکے جا رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی

کون ہو تم؟؟

"اللہ کے واسطے میری مدد کرو۔ایک مجبور ماں ہوں میرے بچے بھوکے ہیں" درد سے بھری آواز میں اب مجبوری صاف سنائی دے رہی تھی جواب دیتے آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔اچھا ٹھیک ہے کچھ دعوت کے برتن سمیٹنے اور کچھ گھر کی صفائی کرنی ہے۔

کیا تم کروگی؟۔۔۔۔۔

ساری صاف صفائی سے نپٹ کر رات دیر گئے گھر میں کچھ روپے اور کھانے کے ساتھ داخل ہوئی تو تینوں بچے دروازے کی طرف دیکھتے آزو بازو بے جان سے پڑے تھے۔دوڑ کر بچوں کے سرا پنے دونوں زانو پر کھینچ کر رکھ لیے انکے ڈوبتے نفس دیکھکر تڑپ اٹھی پھر دیوانہ وار پکارنے لگی۔میرے بچوں اٹھو دیکھو میں کھانا لے آئی ہوں۔اٹھو کچھ کھالو۔اٹھو، اٹھو اب اٹھ بھی جاؤ۔تم کو کھانا ہوگا۔کھانا ہی ہوگا۔کھاؤ۔کھاؤ نا۔میرے بچوں ں ں۔۔۔۔۔زارو قطار رونے لگی پھر دیوانہ وار بچوں کے منہ کھول کر کھانا ٹھونستی اور کبھی انکے ہاتھوں کو حرکت دیکر دیکھتی تو کبھی منہ پر تھپ تھپاتی جاتی۔غذا نے کچھ دیر کے بعد اپنا کام کیا، بے دم بچوں میں جان آنے لگی۔اب ایک راہ نکل آئی تھی۔مستقل کام کرنے روز جانے لگی۔ایک گھر سے دوسرا ملا اور پھر تین تین جگہ کام کرتی رہی۔دن کا بڑا حصہ محنت مشقت میں گزرتا مگر ایک اطمینان زندگی میں در آیا تھا بچوں کو پڑھا لکھا کر اپنی محرومی دور کرنی تھی۔زندگی کو جینے کا مقصد مل گیا تھا۔

میں زمانے بھر کی تلخیاں سہہ کر رات دن اپنے بچوں کے لئے سایہ دار گھنا درخت بنی کھڑی رہی۔مجھے اپنی محنت کا صلہ مل گیا۔تینوں بیٹے پڑھ لکھ کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوگئے ہیں۔اطاعت گزاری فرمابرادی کے ساتھ پڑھے لکھے انکے بیوی بچوں کو دیکھکر مجھے لگتا ہے علم کی روشنی سے در و دیوار منور ہیں اور میری جہالت کی تاریکی و بدشوقی میرے کمرہ سے باہر جھانک کر مسکراتے ہوئے غائب ہوجاتی ہے۔

اوہو یہ آواز کیسی ؟ شاید میرا پوتا پھر مجھے دیکھنے آرہا ہے۔آج عید کے دن فیملی کے ساتھ میرے باہر چلنے سے انکار پر اسے دیکھ ریکھ کی ذمہ داری دی گئی ہے۔

آہٹ پر اپنے موٹے آنسو چھپا کر آنکھیں تو میں نے بند کرلیں مگر ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کیسے چھپاؤں جو میرے درد کی غماز ہے۔

۔۔۔۔!!!

□□□

فرہنگ آصفیہ سے

قِران ۔ع۔اسم مذکر۔(۱) نزدیکی۔قربت۔اتصال(۲) ساتوں ستاروں میں سے سورج کے علاوہ کوئی سے دوستاروں کا سنجوگ۔لگن۔گرہ۔دوستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا

لیتا ہے جب وہ ہاتھ میں آئینہ اس گھڑی

باہم قران شمس و قمر ہے بھی اور نہیں (مصحفی)

زہرہ مُشتری ہر بسپت کے ساتھ اور چاند کا زہرہ کے ساتھ قران ہونا مولود کے حق میں نہایت مبارک خیال کیا جاتا ہے چنانچہ صاحب قران ایسے ہی مولود کے واسطے آتا ہے چونکہ یہ قران برسوں میں یعنی دس۔بیس۔تیس۔چالیس۔اسی۔یا ایک سو بیس برس بعد واقع ہوا کرتا ہے اس سبب سے جگ یعنی مدت دراز سے بھی مراد لیا کرتے ہیں۔

طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہم قرین

گرچہ بہت قران مہ و مشتری ہوئے (ذوق)

قِرانُ السَّعدَین ۔ع۔اسم مذکر۔(۱) دو اچھے ستاروں کا سنجوگ۔شبھ گھڑی۔شُبھ لگن۔شگون نیک۔ساعت سعید(۲) دو نیک یا اچھے آدمیوں کا اجتماع(۳) امیر خسرو دہلوی کی ایک منظوم کتاب کا نام جس میں بغراخاں اور کیقباد باپ بیٹوں کے باہم ملاپ ہو جانے کی کیفیت درج ہے۔

قِران کرنا ۔ا۔فعل متعدی۔اب متروک(۱) نزدیک ہونا۔دوسیاروں کا ایک برج میں ہونا(۲) کسی ایسی بات کو کرکے دکھانا کہ جس کے وقوع سے کمال تعجب ہو۔کارسگڑ کرنا

شرمندہ ہوئے ہیں طالع خورشید و ماہ دونوں

خوبی نے تیرے منہ کی ظالم قران کیا ہے (میر)

سورج کی موت

سلمیٰ صنم

ارے یہ کیا؟ صبح کا اخبار الٹتے ہوئے جیسے ہی آفتاب خان کی نظر اس سرخی پر پڑی کہ سورج دھیرے دھیرے گل ہو رہا ہے۔ وہ بے اختیار چونکے...... ہوگا یہ کوئی سائنسی انکشاف انہیں کیا پتہ۔ وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ سورج تو سوا نیزے پہ اُنکا آگ اُگل رہا ہے اور پیاس کا وہ عالم ہے کہ ساتوں سمندر پی جائے تب بھی نہ بجھے انہیں لگا وہ ہانپ رہے ہیں جل رہے ہیں۔ راکھ ہو رہے ہیں...... ”نمستے ساہوکار“ کسی کی آواز انہیں خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔ دیکھا وہ حجام مادا تھا۔

”یہ سویرے سویرے کون آمرا“ ان کا سارا وجود ہی جیسے آگ بن گیا، مگر وہ چپ سا ہاتھ باندھے کھڑا ان کی ساری تپش سہتے ہوئے اتنا مودب لگ رہا تھا کہ لگا، ہوا کا ایک جھونکا سا آیا ہو۔ اور ان کے تپتے وجود کو چھو گیا ہو، وہ سنبھل سے گئے، نہیں اس وقت نہیں مادا دو بجے آنا“ وہ بولے ”روپیہ ضرور ملے گا اور وہ بھی آج ہی“

مادا نے بے یقینی کے عالم میں ان کی جانب دیکھا، اس نے دو بار شیونگ کی تھی ان کی۔۔ اسے بالکل پتہ تھا روپیہ آج نہیں ملے گا، ایسا کئی بار ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ کچھ نہ بولا اور ان کا مان رکھتے ہوئے چپ چاپ چل دیا۔

یہ تھوڑی سی عزت...... یہ ذرا سا مان...... آفتاب خان کے اندر کہیں طمانیت کی ایک لہر سی ابھری، کیا ہوا؟ وہ پہلی سی شان و شوکت نہ رہی ہو، کہلاتے تو وہ آج بھی ساہوکار ہی تھے، بس ایک لمحہ ایک چھوٹا سا لمحہ۔۔۔ اور پھر وہی تپش وہی سوا نیزے پہ اُنکا سورج اور وہی پیاس کا عالم کہ ساتوں سمندر پی جائے تب بھی نہ بجھے انہوں نے بے اختیار سوچا کاش کہ جو کل سنا تھا وہ خواب ہی ہوتا مگر وہ تو ایک حقیقت تھی، بھرپور، توانا، دھڑکتی ہوئی سانس لیتی ہوئی۔ وہ جو اپنی ننگی پیٹھ پر سورج اُٹھائے ان کی حویلی کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس رمضان کے لونڈے نے اتنی جرأت کی تھی اپنے چچا کریمو کو بھیجا تھا۔ ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے۔ اور اس وقت آفتاب خان کو یوں لگا تھا کہ، جیسے زلزلے کا ایک شدید جھٹکا آیا ہو اور وہ آسمان کی بلندیوں سے تحت الثریٰ کی پستیوں میں جا گرے ہوں...... یہ ...... یہ کیسے ممکن ہے؟ مانا کہ لونڈا تعلیم یافتہ، ڈسٹرکٹ کلکٹر تھا، مگر پھر بھی۔۔ پھر بھی تھا نہ ایک نیچ خاندان کا ہی نا، اس کا دادا رحیمو ان کے دادا لیاقت خان کے پاؤں دابنے پر مامور تھا، دادی خیرون بی، حویلی میں جھاڑو لگایا کرتی تھی، یہ بات تو سارا گاؤں جانتا تھا، بھولا تو کوئی نہ تھا، بھول تو شاید رمضان کے گھر والے گئے تھے جو شہر سے ہجرت کر کے اتنا اونچا اُڑے تھے کہ اب حویلی کے عظیم الشان گنبدوں پہ بیٹھنے کے تمنائی تھے، اُف، اتنی ریاکاری، کمینگی۔ وہ تو بت سے بن گئے، بے یقینی کے نشتر ان کے اندر کہیں دور تک بہت گہرے اتر گئے، ایک دلخراش حیرانی ان کے وجود پر حاوی ہوگئی، جی چاہا بے اختیار چاہا کہ اپنے تایا کی طرح اپنی جوتی نکالے اور بے طرح مرمت شروع کر دے سالے کریمو کی خبیث اپنی اوقات بھول گیا تھا، وہ تو بھلا ہو ان کے بھائیوں کا جو اس کو باتوں میں لگا کر حویلی سے باہر لے گئے، ورنہ تو وہ وحشی بے لگام منہ زور خواہش ان سے کچھ بھی کروا لیتی، کچھ بھی۔

سالا کریمو تو چلا گیا مگر ان کے اندر سورج جھونک گیا جو سوا نیزے پہ اُنکا آگ ہی آگ اگل رہا تھا، اور پیاس کا وہ عالم تھا کہ ساتوں سمندر پی جائے تب بھی نہ بجھے انہیں لگا وہ ہانپ رہے ہیں، جل رہے ہیں، راکھ ہو رہے ہیں۔......

''نمستے ساہوکار'' کسی کی آواز پھر انہیں خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی...... دیکھا سوری اور شنکر تھے جن کے باپ دادا بھی ان کی زمینوں کے حصے دار تھے، ان کی کل پانچ ایکڑ زمین پر وہ فصل اگانے پر مامور تھے، اور زراعت کا فقط ایک تہائی حصہ ہی زمینداروں کی نذر کیا جاتا تھا، مگر بھلا ہو بھارت سرکار کا کہ ملک کے زرعی نظام کے فروغ کی خاطر Tenancy Act نکالا اور حصہ دار مالک بن گئے۔

اُف! آفتاب خان کی الجھن صدیوں کی تھکی ہوئی ویرانی پر محیط ہوگئی، ان دونوں کو اپنے آگے بٹھاتے ہوئے ان کے دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا، وہ جن کے اجداد ان کے آگے کھڑے نہ ہو پاتے تھے وہی لوگ یوں آج ان کے روبرو تھے، جیسے ان ہی میں سے ایک ہو۔ ان ہی کے وجود کے حصے دار ہو۔

''ساہوکار میری شادی ہے'' سوری نے بڑے ادب سے دعوت نامہ پیش کیا۔

وہ بولے کچھ نہیں کیا کہتے؟ یہ وقت بھی کس قدر جلد بدل جاتا ہے، انہیں اخبار کی سرخی یاد آئی، جب تابناک سورج گل ہوسکتا ہے تو وہ...... وہ کیوں نہیں۔

"آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ کا آنا ضروری ہے'' رخصت لیتے ہوئے۔ جب سوری نے یہ بات کہی تو وہ بے اختیار چونک پڑے، اس کا چہرہ تکنے لگے، لگا ہوا کا ایک جھونکا سا آیا ہو اور ان کے تپتے وجود کو چھو گیا ہو، یہ تھوڑی سی عزت...... یہ ذرا سا مان، کہیں اندر طمانیت کی ایک لہر سی ابھری، اتنی وفاداری...... اتنی شان تو انہوں نے ضرور رکھ چھوڑی تھی کہ گاؤں میں آج بھی ایسا کوئی نہ تھا جو ان کی عزت نہ کرتا تھا، ان کے خلاف مرضی آج تک کسی نے کوئی بات کی تھی نہ کوئی حرکت، مگر وہ رمضان کا لونڈا اور اس کی جرأت پتہ نہیں کیسے اور کیوں کر کہاں ڈھیل دی تھی انہوں نے کہ وہ سر پر آ بیٹھنے کا روادار ہوا تھا، پیاسے صحرا کی سلگتی ہواؤں کی طرح ان کا وجود بے سمت و بے منزل ہونے لگا، ان کے اندر چیختے سناٹے کچھ اور گہرے ہونے لگے، سوری اور شنکر تو گئے، اور بیتے ہوئے دست بستہ لمحوں کا کرب ان کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

ملک کو آزادی ملے تو برسوں بیت چکے تھے مگر لیاقت خان کی زمینداری تو اب بھی قائم تھی، تقریباً دو سو ایکڑ زمین، ناریل، آم، سپوٹے، اور شہتوت کے بے شمار باغات ایک عظیم الشان حویلی...... بے شمار نوکر...... بے حساب مویشی...... کیا کچھ نہ تھا ان کے پاس...... جس کا سارا انتظام ان کے بڑے بیٹے شجاعت خان کے ہاتھوں میں تھا۔ جو کچھ اتنے بے رحم، سخت دل اور جلاد قسم کے شخص تھے کہ ان کی بے مروتی دل آزاری، غیر انسانی سلوک کے چرچے چاروں دشاؤں میں تھے، مجال تھی جو کوئی ان کے خلاف آواز اُٹھاتا۔ ذرا سا خلاف مرضی کچھ ہوا نہیں کہ وہ آدمیوں کو درختوں سے باندھ کر ان پر کوڑے برساتے یا اپنے پیر کی جوتی نکال کر بے طرح مرمت کر ڈالتے۔ ان کا وہ رعب وہ دبدبہ تھا کہ جسے دیکھ کر جاگیردارانہ نظام کی یاد آجائے حالانکہ گاؤں میں تو پنچایت راج تھا (یہ الگ بات ہے کہ سرپنچ تو لیاقت خان ہی تھے)

اور رنگین مزاج اس قدر تھے کہ گاؤں کی کوئی بھی عورت پسند آجاتی تو اس کو اُٹھوا لیتے، فلموں کا بے حد شوق تھا۔ اس لئے گاؤں میں ایک Tent بھی لگوایا جہاں رنگین فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

گاؤں میں سب کچھ پہلی مرتبہ لیاقت خان لے کر آئے تھے، اپنے بڑے پوتے کے لیئے بائیسکل۔ اعلیٰ نفیس ڈبے بند بسکٹ سے لے کر، حویلی کے لئے Philips کا ریڈیو، ٹیلیفون، موٹر کار اور مستورات کے لئے، یارڈلی (لندن کا) پوڈر، زیورات، انواع قسم کے عطر اور بھی بہت کچھ۔

گاؤں کی آبادی مسلمانوں، اونچی نیچی ذات کے ہندوؤں کے علاوہ بے شمار ہریجنوں پر مشتمل تھی، صرف چند معتبر لوگوں کو چھوڑ کر ایسا کوئی شخص نہ تھا سارے گاؤں میں جو زمینداروں کے آگے کھڑا ہوسکتا تھا، بیٹھنا تو بہت دور کی بات تھی، جس کو بھی حویلی کے آگے سے گزرنا ہوتا تھا اس کو اپنے جوتے چپلیں ہاتھوں میں لے کر گزرنا ہوتا تھا اور وہ بھی ننگے پاؤں یہی اس حویلی کا قانون تھا۔

گاؤں کے اکلوتے مندر میں جب بھی کوئی تہوار ہوتا دل کھول کر چندہ زمینداروں کے ہاں سے پہنچتا تھا، کچھ اس طرح مسجد میں جب بھی کوئی تبلیغی جماعت آتی وہ مسجد کے بجائے حویلی میں قیام کرتی تھی، امام، مؤذن تو حویلی میں ہی پلتے تھے، عید بقرعید کے موقع پر حویلی میں جماعت کا اہتمام ہوتا تھا اور وہاں سے لوگ عیدگاہ پہنچتے تھے۔ رجب کے کونڈے گیارہویں کی دعوتیں۔ میلاد کی محفلیں، شب برأت کے جلسے، محرم کے تعزیے، علم، چونگے، شربت، بقرعید کی قربانیاں یہ تمام عید کے تہوار کچھ اس قدر دھوم دھام سے منائے جاتے تھے کہ آس پاس کے گاؤں سے لوگ حاضری دیتے تھے۔

اُف! یہ شان و شوکت، یہ حکومت، ...... یہ سب پہ چھا جانے کی منہ زور خواہش ...... یہ عزت و تکریم حاصل کرنے کا بے لگام جذبہ...... یہ ظلم ڈھانے کی شیطانی جبلت یہ سب کچھ فقط ایک Tenancy Act کے تحت تباہ ہوگیا، ملک کی ترقی کی خاطر سرکار نے زمینداروں کی وہ حالت کی

کہ کچھ نہ رہا کچھ نہ بچا، حویلی والے آسمان کی بلندیوں سے تحت الثریٰ کی پستیوں میں یوں جا گرے کہ عمر بھر کو اُٹھ نہ سکے، کل تک جو ان کی دوسوا ایکڑ زمین کے حصہ دار تھے وہ آناً فاناً ان زمینوں کے مالک بن بیٹھے، پھر تو گاؤں کی ہوا ہی بدل گئی، ساری جماعتیں مسجد کو منتقل ہو گئیں مسجد کے صدر کوئی اور بن بیٹھے، مندر کے چندے بند ہو گئے۔ باقاعدہ الیکشن کے تحت گاؤں میں سرپنچ کا چناؤ ہونے لگا اور یہ سب کچھ ایسا نہ تھا کہ لیاقت خان برداشت کر پاتے اس سانحے نے تو ان کی جان ہی لے لی، شجاعت خان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر کے ہو رہے اور آفتاب خاں کے والد تو بہت پہلے ہی داغ مفارقت دے چکے تھے۔ اب بھرے پرے خاندان کی ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر آ پڑی، جو کچھ بچ رہا تھا اس کو انہوں نے اپنی ماں اور تائی کی مدد سے سنبھالا...... بہنوں کی شادیاں کیں، بھائیوں کو تعلیم دلوائی، مگر کبھی کسی کے آگے جھکے نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا، اپنی خاندانی آن وبان کا کچھ زیادہ ہی پاس ولحاظ تھا انہیں اور اس کے لئے کیا کچھ نہیں سہا انہوں نے، کتنی ذہنی اذیتیں نہ اُٹھائیں...... کیسی کیسی مشقتیں نہ جھیلی مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ من ہی من وہ کڑھتے رہے، ٹوٹتے بکھرتے رہے، مسمار راتوں کے سسکتے ہوئے لمحوں میں اپنی باطنی بے کیفی سے الجھتے رہے، اپنی صلیب آپ اُٹھا کر ذلت کی راہوں میں دور تک اکیلے تنہا چلتے رہے، لوگوں نے تو وہ درد دیئے کہ وہ اُف بھی نہ کر سکے۔ معتبر لوگ تو دور نچ لوگوں کے بچے بھی تعلیم سے آراستہ ہو کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے لگے۔ اور شہر ہجرت کر کے وہاں سے دولت کما کر گاؤں میں اپنی جھوٹی شان وشوکت دکھلانے لگے، گاؤں میں بہت سے لوگوں کے پاس موٹر کاریں، ریڈیو، ٹی وی اور بہت سی نمائش کی اشیا کیا آئیں کہ وہ سب خود کو گاؤں کے رئیس زادوں میں شمار کرنے لگے، پھر دیہی ترقی کے منصوبوں کے تحت گاؤں نے اتنی ترقی کی کہ اس کا نقشہ ہی بدل گیا، لیکن اگر کچھ نہ بدلا تھا تو وہ آفتاب خان کی سوچ تھی، ان کی نگاہوں میں وہ آج بھی رئیس خاندانی شخص تھے، کیا ہوا زمین نہ رہی تھی کہلاتے وہ اب بھی ساہوکار ہی تھے، حالانکہ ہر کسی کو پتہ تھا کہ ان کی معاشی حالت مستحکم نہیں، مگر کسی نے کبھی بھی انہیں اس بات کا احساس نہیں دلایا تھا، انہیں پتہ تھا ان کی پشت پر تو لوگ دنیا جہاں کی باتیں بناتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں، مگر سامنے آ کر کبھی کسی نے منہ کھولنے کی جرأت نہ کی، اور آج اتنے سالوں بعد پہلی مرتبہ، ہاں بالکل پہلی مرتبہ...... رمضان کے لونڈے نے یہ حرکت کی تھی۔ اتنی ذلت...... اتنی توہین۔۔۔ اُف!! ان کے جسم وجان پر ایک دل فگار سناٹا پھیل گیا۔ ان کے سینے سے اتنی دردناک چیخیں ابھریں کہ ان کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا۔ غصہ، پشیمانی،، بے چارگی کے گرم گرم ابلتے آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھیگنے لگا، یہ شب و روز کی تپش یہ جلن یہ اذیت ایسی نہ تھی جو حویلی میں کسی سے چھپی رہتی، بھائیوں نے جو ان کی یہ حالت دیکھی تو بہت سمجھایا۔

''زمانہ بدل گیا ہے بھائی صاحب'' وہ بولے ''اب کسی شخص کا معیار اس کی خاندان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شخصی قابلیت سے قائم کیا جاتا ہے، رمضان کا لونڈا ڈی سی ہے وہ چاہے تو سارے گاؤں کی تقدیر بدل سکتا ہے، آپ خود پر قابو رکھئے۔ اور یہ سوچیے کہ آپ اپنی بچی کا بیاہ ایک خاندان سے نہیں ایک شخص سے کر رہے ہیں''۔

آفتاب خاں نے سب کچھ سنا۔ بھائیوں نے جو کہا وہ غلط تو نہ تھا لیکن کیا کرتے، اس دل کا کیا کرتے جو یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اپنی لخت جگر کو لیاقت خاں کی پڑپوتی کو ان کے خدمت گاروں کے حوالے کر دیں۔

بھائیوں نے لونڈے کو حویلی آنے کی دعوت دی، وہ چپ رہے بھلا اور کرتے بھی کیا؟ کہیں اندر یہ سوچ تھی کہ گاؤں والے اس رشتے کو صحیح نہ جانیں گے، مگر لونڈا جب گاؤں آیا تو ہر کسی نے اس کی وہ آؤ بھگت کی کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے، سب بھول چکے تھے کہ وہ رمضان کا وہی لونڈا ہے جو اپنی ننگی پیٹھ پر سورج اُٹھائے حویلی کی بکریاں چرایا کرتا تھا، ان کے لئے تو وہ اب ڈی سی کامران تھا جس کی وجاہت، لیاقت اور مالی حیثیت سے ہر کوئی مرعوب تھا، آج لیاقت خاں کی پڑپوتی کی کوئی اہمیت نہ تھی، جو تھا وہ ڈی سی کامران تھا، وہاں کوئی یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ کامران خوش نصیب ہے جو اسے ساہوکار کی بیٹی مل رہی ہے، بلکہ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ قمر خوش قسمت ہے جو اسے کامران مل رہا ہے۔ اُف!! یہ روح فرسا تغیر، یہ حوصلہ شکن انقلاب...... وقت کی یہ المناک کروٹ آفتاب خاں کو لگا جیسے زلزلے کا ایک شدید جھٹکا آیا ہو، اور ساری کائنات زیروزبر ہو گئی ہو، وہ خود کو کہاں چھپاتے کیا کرتے؟

کامران نے حویلی میں قدم رکھا تو آفتاب خاں نے دیکھا کہ سورج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہے، اور دوپہر کی سلگتی دھوپ سارے گاؤں کو گرما رہی ہے۔

جب یہ تابناک سورج ہی گل ہو سکتا ہے تو وہ...... وہ...... آفتاب خاں نے بے اختیار سوچا، وہ کیوں نہیں اور دفعتاً انہیں لگا جیسے سورج گل ہو چکا ہے، مر چکا ہے، اور چاروں طرف اندھیرا پھیل رہا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ سارا اندھیرا دھیرے دھیرے ان کے دل میں اترنے لگا!!

□□□

بھولی ہوئی یادوں کی کسک

رضوانہ ساغر روزی

شام ہر روز اداس کرتی ہے
تیرے بنا یہ زندگی اک سراب لگتی ہے
تو تھا تو یہ زندگی سنورتی تھی روزی
اب یہ تنہائی ہر روز مجھے ڈستی ہے

اندھیرے پر اپنا ڈیرہ جما کر صبح نمودار ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ تازہ ہوا سے ماحول پر کشش و خوشگوار سا بنا ہوا تھا۔ پرندے چہچہاتے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ چڑیوں کے غول کے غول درختوں پر بیٹھے باتیں کرنے میں مگن تھے۔ 'آفندی ولا' میں ناشتے کی ٹیبل پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

'ہاں تو برخوردار کیا سوچا ہے پھر آپ نے۔' تیمور اشعر آفندی اپنے خوبرو و اسمارٹ سے بیٹے اریب تیمور آفندی سے کہنے لگے۔

'میرا فیصلہ ابھی بھی وہی ہے پاپا۔' اریب پورے اعتماد کے ساتھ کہنے لگا۔

'اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو اریب۔' تیمور آفندی کہنے لگے۔

'جو محبت کرتے ہیں وہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی نہیں کرتے پاپا۔ میں شادی کروں گا تو صرف اور صرف فلک سے۔ آپ کیا جانے پاپا سچی محبت کیا ہوتی ہے۔ اگر ہم اس سے بچھڑ جائیں تو زندگی جینا بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ شاید آپ نے کبھی کسی سے سچی محبت نہیں کی پاپا۔ میں نے فلک سے سچی محبت کی ہے پاپا میں اسے ہر حال میں اپناؤں گا۔' اریب کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا اور تیمور اشعر آفندی کی شخصیت آندھیوں کی زد میں گھر گئی۔ تیمور اشعر آفندی کے کانوں میں اریب کا جملہ بازگشت کرنے لگا۔ 'آپ نے شاید سچی محبت نہیں کی۔' کیا تیمور اشعر آفندی کی طرح بھی کوئی محبت کر سکتا ہے۔ وہ نڈھال سے اپنے روم سے متصل اسٹڈی روم میں ریوالنگ چیئر پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس کے ذہن کے پردے میں چھن سے ایک چہرہ اتر آیا جو اکثر اس کی تنہائی کا ساتھی تھا۔ وہ آج بھی اسے اپنی یادوں، باتوں اور دعاؤں میں یاد رکھتا تھا۔ وہ جس سے اس نے سچی اور پاک محبت کی تھی۔ آج بھی جب وہ اسے یاد آئی تو درد دل پھر سے لوٹ آیا۔ بے شمار باتیں، وعدے، یادیں وہ پیار کے دن، وہ محبت کے لمحے ذہن کی اسکرین پر دوڑنے لگے۔ تیمور اشعر آفندی بھولی اور گزری ہوئی یادوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ماضی کے دھندلکوں میں کھوتا چلا گیا۔

وہ آملا تو فاصلے گھٹتے چلے گئے
بچھڑے تو سارے راستے سنسان کر گیا
بچھڑا کچھ ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

نیلے فلک کی اوٹ سے سورج اپنی کرنوں سمیت جھانک رہا تھا۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ بہت سے پرانے اسٹوڈنٹ یونیورسٹی کے کیمپس میں لگے جھاڑوں کے سائے تلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گرم ہوائیں پورے کیمپس کا احاطہ کیے ہوئی تھی۔ یونیورسٹی میں آج بہت گہما گہمی تھی نئے اسٹوڈنٹ نوٹس بورڈ پر لگی ایڈمیشن لسٹ میں اپنا نام ڈھونڈ رہے تھے تبھی سیکنڈ ایئر کا Inteligent Group وہاں پہنچا۔

'یار چلو دیکھتے ہیں کہ اس بار کون سا تارا تیمور اشعر آفندی کو ٹکر

دینے آیا ہے۔' مامون مسکراتے ہوئے کہنے لگا تو وصی اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہنا لگا۔

'کوئی ابھی تک ایسا نہیں آیا جو ہمارے تیمور کو ٹکر دے سکے۔'

'ارے یار چلو پہلے دیکھ تو لیتے ہیں' اکمل کہنے لگا تو وہ سب نوٹس بورڈ کے قریب پہنچ کر لسٹ پڑھنے کی کوشش کرنے لگے جہاں پہلے ہی بہت سے اسٹوڈنٹ کا ڈیرہ تھا۔

'یار تیمور بتا نا کون ہے ٹاپ پر' احمد کو کھلبلی مچی۔

'میرے یاروں کوئی عظمیٰ آورش' نام کی چڑیل ہے جو مجھے ٹکر دینے آئی ہےBut اسے پتہ نہیں کہ تیمور اشعر آفندی کیا چیز ہے۔' تیمور کے لہجے میں غرور جھلک رہا تھا۔ اور ان کے پیچھے کھڑی عظمیٰ آورش کو تو پتنگے ہی لگ گئے۔

'Excuse me' مسٹر سمجھتے کیا ہو خود کو کہیں کے پرنس ولیم ہو جو اتنی اکڑ ہے۔ اگر اس اکڑ کو میں نے ڈھیر نا کیا تو میرا نام بھی عظمیٰ آورش نہیں' وہ چیلنجنگ لہجے میں کہنے لگی۔ اور وہ پانچوں بس اسے دیکھے گئے۔ ریڈ ٹاپ پر بلیک جینس پہنے، اسٹائلش سیٹ کیے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ ساری لڑکیوں کو مات دے رہی تھی۔ نیلی آنکھوں میں گھمنڈ کی پرچھائیاں ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

'what، تم میری اکڑ کو ختم کروگی۔ تم ہو کیا چیز' تینوں قہقہہ لگانے لگے۔

'ہونہہ گھمنڈی اکڑو' کہہ کر وہ پلٹ کر چل دی۔

'یار کیا بولڈ لڑکی ہے۔' احمد کہنے لگا۔

'بولڈ، مائے فٹ اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی اب میں بتاتا ہوں اسے کہ میں کون ہوں' وہ بھپرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

'یار کول ڈاؤن، ایسا کیا کہہ دیا اس نے جو تم اس طرح ری ایکٹ کر رہے ہو چلو چھوڑو ہمیں کلاس اٹینڈ کرنی ہے۔' وصی اسے سمجھانے لگا۔ پھر وہ چاروں اسے سمجھاتے ہوئے کلاس میں لے گئے۔ سارا دن اس کا موڈ آف ہی رہا۔ وہ ایسا ہی تھا مغرور گھمنڈی، لڑکیوں سے لاتعلق رہنے والا پتھر دل مغرور شہزادہ۔ بڑی سی براؤن آنکھوں میں ذہانت کی چمک لیے وہ سب میں ممتاز نظر آتا تھا۔

'مغرور، گھمنڈی، اکڑو سمجھتا کیا ہے خود کو۔ صنف نازک کی عزت کرنا شاید اسے آتی ہی نہیں' صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے وہ خود سے باتیں کرنے لگی۔

'ارے بھئی کس کو ان القابات سے نوازا جا رہا ہے۔' معظم آفریدی جو ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے عظمیٰ آورش سے پوچھنے لگے۔

'السلام علیکم بابا جان' وہ اٹھتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈالے سلام کرنے لگی۔

'وعلیکم السلام بابا کی جان' وہ اس کا ماتھا چومنے لگے۔

'ہے ایک بدتمیز انسان دل کی جگہ پتھر فٹ ہے۔ بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے اس گھمنڈی کو' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے کہنے لگی تو معظم آفریدی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

'بابا آپ کو ہنسی آرہی ہے میرا بس چلے تو میں اس انسان کو سبق سکھا کر اس کے چودہ طبق روشن کر دوں۔'

'ارے بھئی چھوڑیے ان باتوں کو اور بتایئے آپ کا نام لسٹ میں ٹاپ پر ہوگا یہ تو مجھے یقین ہے۔'

'یس آف کورس بابا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے آپ کی بیٹی ہمیشہ ٹاپ پر ہی رہتی ہے۔' وہ فخریہ انداز میں کہنے لگی تو معظم آفریدی اسے گلے لگاتے ہوئے کہنے لگے۔

'اب آپ صرف اپنی پڑھائی پرConcentrate کریں آخر کو یہ سارا بزنس آپ ہی نے تو سنبھالنا ہے۔'

'کاش بابا میرا کوئی بھائی ہوتا تو یہ بزنس وہ ہی سنبھالتا' روہانسے لہجے میں کہنے لگی۔

عظمیٰ آورش، معظم آفریدی اور زیبا آفریدی کی اکلوتی اولاد تھی۔ عظمیٰ آورش کے بچپن ہی میں زیبا معظم آفریدی کا انتقال ہو گیا تھا۔ معظم آفریدی نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ وہ اس کی ہر جائز خواہش اس کے بن کہے پوری کر دیتے تھے۔ انھوں نے کبھی اسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ پھر بھی ایک خلاء عظمیٰ آورش کی زندگی میں ہمیشہ رہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو بہت مس کرتی تھی رات کی تنہائیوں میں اکثر وہ انھیں یاد کر کے تڑپ تڑپ کر رو دیتی۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ ان سے اپنی فیلنگ، سکھ، دکھ شیئر کرتی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ کہرے دھیرے دھیرے ماحول پر قبضہ جما رہی تھی۔ منچلی ہوائیں ادھر ادھر گشت کر رہی تھی۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ کی کہنیاں ٹکائے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے خلاء میں ان دیکھی شئے تلاش کر رہی تھی۔ صبح کا منظر آنکھوں کے پردے کے سامنے آتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا جسے وہ سوچنا تک نہیں چاہتی

تھی وہ اس کے ذہن کے دریچے سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسی کشش تھی اس تیمور اشعر آفندی میں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوچنے لگی۔

کتنا عجیب ہے ان کا انداز محبت
رلا کے کہتے ہیں اپنا خیال رکھنا

شمس کی تڑپاتی جھلساتی کرنیں آگ اگل رہی تھیں۔ نارنجی گولا قہر برساتا آسمان کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ گرم ہوائیں ادھر سے ادھر چلتی پھر رہی تھیں۔ دن یونہی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ عظمیٰ فائل کا Shadow بنائے جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی کہ تبھی سامنے آتے شخص سے ٹکرا گئی۔

'اوشٹ، یو ایڈیٹ دیکھ کر نہیں چل سکتے کیا۔' وہ فائل اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ جیسے ہی سامنے والے شخص پر نظر پڑی اس کی زبان کو بریک لگ گیا۔ سامنے وہی کھڑوس اور مغرور بندہ تیمور اشعر آفندی غضب ناک انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

'ایڈیٹ میں نہیں تم ہو۔ ماشاءاللہ میری دونوں آنکھیں سلامت ہیں اور میں دیکھ کر ہی چلتا ہوں شاید تم ہی اندھی ہو جو مجھ سے آکر ٹکرا گئی۔' وہ بھی کہاں چپ رہنے والا تھا۔ ہارنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے دو بدو جواب دینے لگا۔

'کاش اندھی ہی ہوتی تو یوں تم جیسے مغرور شخص سے نہ ملتی۔'

اس کے اس طرح کہنے پر تیمور کے دل نے چپکے سے بے ساختہ اللہ نہ کرے کہا تھا۔ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے دل نے ایسا کیوں کیا۔

'یوں تو تم جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی ہو۔' تیمور کے جملے نے تو عظمیٰ آورش کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

'بکواس بند کرو اپنی میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو لڑکوں کے آگے خود کو بچھاتی چلی جاتی ہیں۔ تمھارے جسم میں شاید دل کی جگہ پتھر فٹ ہے جو تم اس طرح سے بات کر رہے ہو تمھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ سامنے والے کے اوپر کیا اثر ہو گا تم تو بس اپنی ہی ہانکتے ہو۔' وہ بنا رکے اسے سنانے لگی۔ ایک لڑکی اسے اتنا کچھ سنا رہی تھی اور وہ اس کا ردعمل ظاہر نہ کرتا ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا غصہ میں اس نے اپنے پیر سے عظمیٰ آورش کے نازک سے پیر پر اتنی زور سے دباؤ ڈالا کہ اس کے انگوٹھے سے خون رسنے لگا وہ تو حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی۔' آئندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے سو بار سوچنا۔' وہ اور بھی کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن عظمیٰ آورش کی آنکھوں سے گرتے شفاف موتی دیکھ کر گنگ سا رہ گیا۔ تکلیف کی شدت سے ضبط کے باوجود عظمیٰ آورش کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل پڑے۔

'آئی ہیٹ یو تیمور اشعر آفندی آئی ہیٹ یو۔' کہتے ہوئے وہ بھاگتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور تیمور اشعر آفندی کو یاد رہا تو اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں سے گرتے شفاف موتی۔' یہ کیا کر دیا میں نے میری وجہ سے عظمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آئے۔' وہ خود کو سرزنش کرنے لگا دن بھر وہ ڈسٹرب رہا۔ چاند معصومیت سے نیلے فلک سے جھانک رہا تھا۔ خلاء میں چاند کی چمک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ نیند تیمور کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تیمور کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار عظمیٰ آورش کا چہرہ آ جاتا اس کی موتیوں سے بھری آنکھیں شکوہ کرتی نظر آتیں وہ بہت زیادہ ڈسٹرب تھا۔ اس کی آنکھیں شکوہ کرتی نظر آتی وہ بہت زیادہ ڈسٹرب تھا۔ اس کا دل اسے بار ہا اس بات پر ملامت کر چکا تھا۔ وہ اپنے دل کی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

'کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ ایسا کیوں اس کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے آ رہا ہے کیوں میں اسے ہی سوچے جا رہا ہوں۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ میں نے جو کیا وہ غلط تھا مگر اس طرح کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ کیوں بار بار میرا دھیان اسی کی طرف جا رہا ہے۔' وہ لامتناہی سوچوں کے ساتھ سفر کرنے لگا۔ تیمور کے کیوں کے جواب میں دل سے صدا آئی

'کیونکہ تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔ تیمور اشعر آفندی۔ تم جو گھمنڈی مغرور مشہور ہو لیکن تم بھی دل رکھتے ہو ہاں تیمور تمھیں عظمیٰ آورش سے محبت ہو گئی ہے۔'

اپنے دل کی صدا پر وہ خاموش سا رہ گیا اور دل کے خانوں میں عظمیٰ آورش کے وجود کو ڈھونڈنے لگا تو وہ بڑے ہی شوق سے وہاں اپنا ڈیرا جمائے ہوئے تھی۔ بنا کچھ سوچے سمجھے وہ اس کے دل کے آئینے میں اپنا عکس بسا چکی تھی۔ وہ دل کی صدا پر ایمان لے آیا۔ یہ انکشاف ہی کتنا خوبصورت تھا کہ اس جیسے گھمنڈی شخص کو بھی محبت ہو گئی تھی۔ دل کی آواز سنتے ہی اس کے لبوں پر بہت ہی پیاری محبت سے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ایک دم سے ریلیکس ہو گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہ بالکونی میں آ گیا۔ ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹکائے وہ بہت ہی محویت سے آسمان میں

چمکتے چاند کو دیکھنے لگا۔ چاند کی چاندنی سے ماحول پر جنون طاری تھا۔ ٹمٹماتے تارے آسمان کی اوٹ سے جھانک رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ تیمور کی خوشی میں خوش ہو رہے ہوں۔

سورج بادلوں سے سرگوشیاں کرتا ہوا آسمان پر نمودار ہوا۔ گرمی کی شدت میں تھوڑی کمی آگئی تھی۔ تیمور کی آج تیاری ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آخری طائرانہ نظر آئینے میں اپنے عکس پر ڈالنے لگا۔ پرفیوم کی آدھی بوتل اپنے اوپر اسپرے کر لی تھی۔ جب وہ یونیورسٹی پہنچا تو اس کے چاروں دوست اس کا ویٹ کر رہے تھے۔

’بھائی کہیں فنکشن میں سے آ رہے ہو کیا۔‘ وصی نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا تو وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔

’کیا ہوا یار تو مسکرا کیوں رہا ہے کون سا فنکشن اٹینڈ کر کے آیا ہے۔‘ اکمل پوچھنے لگا۔

’کوئی فنکشن اٹینڈ نہیں کر کے آیا یارو۔‘

’تو پھر اتنا تیار شیار ہو کے.....‘ احمد پرسوچ انداز میں کہنے لگا۔

’یار تجھے بھی کہیں میری طرح محبت تو نہیں ہو گئی۔‘ مامون جو بہت دیر سے ان کی باتیں سن رہا تھا تیمور کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

’بس مجھے محبت ہو گئی ہے میرے پیارو۔‘ وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا تو وہ چاروں منہ کھولے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

’یہ میں کیا سن رہا ہوں کہیں میرے کان مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے۔ شہر کے مشہور بزنس مین کا مغرور اور گھمنڈی بیٹا تیمور اشعر آفندی کو محبت ہو گئی ہے امپاسبل یار۔‘ سب سے پہلے وصی کا سکتہ ٹوٹا تھا اور پھر سب نے اس کی کلاس لی۔

’کیوں یار کیا میں دل نہیں رکھتا، کیا میں محبت نہیں کر سکتا، کیا محبت صرف تمہارے لیے بنائی گئی ہے۔ یارو یہ محبت بہت عجیب ہے نا چاہتے ہوئے بھی ہو جاتی ہے۔‘

محبت نے تیمور کو سر سے پیر تک بدل دیا تھا۔ محبت نے تیمور کو اپنے پر پھیلا کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

’یہ سب چھوڑو جلدی بتاؤ کون ہے وہ جس سے تمہیں محبت ہوئی ہے‘ احمد پوچھنے لگا تو وہ سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا اس کی نظروں کے تعاقب میں چاروں نے دیکھا تو چاروں ایک ساتھ چیخ پڑے۔

’پاگل ہو گئے ہو تیمور اس سے اچھا تو تم خودکشی کر لیتے تمہیں یہی دھرتی کا بوجھ نظر آیا تھا محبت کرنے کے لیے یار۔‘

اکمل غم زدہ سے لہجے میں کہنے لگا تو تیمور کو گڑبڑ کا احساس ہوا اس نے ان کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو اس کا ہنسی سے برا حال ہو گیا۔ ان کی یونیورسٹی کی سب سے موٹی لڑکی وہاں کھڑی تھی۔

’میرے دوستوں میری محبت عظمیٰ آورش ہے نا کہ وہ دھرتی کا بوجھ‘

ان چاروں کو چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگا۔

’ناممکن تیمور تم اور عظمیٰ آورش سے محبت۔ کہیں تم اس سے بدلہ لینے کے لیے تو یہ سب نہیں کر رہے ہو۔‘ وصی کہنے لگا۔

بدلہ، کون سی چیز کا بدلہ میں تو اس کی محبت میں بہت آگے نکل چکا ہوں۔ جب اس کے بنا جینے کا تصور کرتا ہوں تو میری سانس رک جاتی ہے۔‘ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر رہی تھی اور وہ کھڑی عظمیٰ آورش اس کی مسکراہٹ میں کھوتی چلی گئی۔

’کاش خدایا یہ کھڑوس بندہ اسی طرح مسکراتا رہے۔‘ وہ دل میں سوچنے لگی۔ بلیک ٹی شرٹ پر جیکٹ پہنے، گوگل لگائے وہ بے پناہ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ خدا نے اسے فراخ دلی سے وجاہت دی تھی۔

’کیا اسے پتہ ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو، آئی مین تم نے اپنی محبت کا اظہار کیا اس سے۔‘

نہیں ابھی نہیں لیکن بہت جلد میں اپنی محبت کا اظہار عظمیٰ آورش سے کروں گا۔‘

’مطلب یہ محبت یک طرفہ ہے شاید تمہیں پتہ بھی نہیں کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔‘ اکمل کہنے لگا۔

محبت کے پھول نے اپنی خوشبو تیمور کے اطراف بکھیر دی تھی اور وہ یہی خوشبو عظمیٰ آورش کو دینا چاہتا تھا۔ محبت کی اوس جب اس پر گری تو زندگی ہی بدل گئی وہ محبت کی بارش میں بھیگتا چلا گیا۔

تیمور لائبریری میں بیٹھا کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔ ایسے ہی سرسری سی نظر لائبریری میں دوڑائی تو عظمیٰ کو وہاں پا کر بے ساختہ مسکرا دیا اور اس کی ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔

’ہیلو۔‘ اس کے قریب پہنچنے پر کہنے لگا۔ عظمیٰ جو کتاب پڑھنے میں منہمک تھی اس کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

’کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔‘ اس کے جواب دیے بنا وہ چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ آورش صدمے کی سی کیفیت میں دو چار تھی۔ وہ

بندہ جو کبھی کسی لڑکی سے بات نہیں کرتا تھا کبھی اس سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی جو اپنی زبان سے کسی سے بھی بدتمیزی کرتا تھا وہ اتنی تمیز کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

'آئی ایم سوری عظمیٰ آورش۔' وہ دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

'کس بات کے لیے۔' لہجہ اجنبی سا تھا۔

'کل والی بات کے لیے۔ وہ مجھے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا۔ آپ کی چوٹ کیسی ہے۔' اور وہ بس سوچ کر رہ گئی کہ خود چوٹ دینے والا پوچھ رہا ہے کہ چوٹ کیسی ہے۔ اس کے پوچھنے پر اس نے اپنا پیر آگے کی طرف کر دیا۔ نازک پیر کے انگوٹھے پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔ اس کی چوٹ دیکھ کر تیمور کو اپنی غلطی کا پھر سے احساس ہوا۔ 'تم جیسے پتھر دل انسان ایسے ہی کر سکتے ہیں۔ کسی کو زخم دے کر پوچھتے ہو کہ درد تو نہیں ہو رہا۔ کیا تم تمھارے دیے درد کا مداوا کر سکتے ہو نہیں کبھی نہیں کیونکہ تم ایک سخت دل انسان ہو اور سخت دل انسان کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تیمور اشعر آفندی۔' کہتے ہوئے اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

'نفرت کرتی ہوں میں تم سے تیمور اشعر آفندی' اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی جھوٹ بول کر اور تیمور اسے چاہتے ہوئے بھی نہ روک پایا۔

'میں اپنی محبت سے اس نفرت کو ختم کر دوں گا یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔'

وہ حرف دعا کہاں سے لاؤں
جو تجھے میرا صرف میرا کر دے

'کاش خدایا اسے میری محبت کا علم ہو جائے کہ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ پتہ نہیں اس شخص میں کون سی کشش ہے جو میرا دل اسی کے لیے مچل رہا ہے اسی کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اسی کے لیے دھڑک رہا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے یا رب اے میرے خدا تو اسے میرا کر دے یا پھر مجھے فنا کر دے۔ اگر وہ مجھ سے جدا ہو گیا تو میں جی نہ پاؤں گی۔ یہ محبت کا روگ مجھے چمٹ چکا ہے یا رب تو اس کی محبت میری جھولی میں ڈال دے۔ یہ عشق کی آگ میں کیسی تڑپ ہے یا رب کہ اس میں جلنا تڑپنا سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ محبت کے رنگوں سے میری زندگی بھر دے۔' عظمیٰ آورش سجدے میں سر جھکائے اپنے رب سے دعا مانگ رہی تھی۔ اگر محبت نہ ملے تو ہم ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اگر محبت نہ ملی تو یہ محبت کی راہیں سنسان اور ویران ہو جاتی ہیں۔ محبت کے بنا پوری دنیا کے ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ زندگی میں ہر کسی کو محبت نہیں ملتی۔ محبت جب خود سے بچھڑتی ہے تو بہت درد دیتی ہے انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتا ہے۔ یہ محبت بھی کیا چیز ہے یہ جب انسان کو اپنی گرفت میں لیتی ہے تو اسے بہت سی خوشیاں دیتی ہے یا پھر ان کے دامن کو کانٹوں سے بھر دیتی ہے۔ پیار کی راہوں میں بے شمار دریا ملتے ہیں۔ بالکل طوفانوں کی طرح لیکن عشق کرنے والے ان دریاؤں کو بھی پار کر جاتے ہیں۔

تیمور اشعر آفندی اپنے دوستوں سے بات کرنے میں بزی تھا کیونکہ آج چاروں نے ہی یونیورسٹی سے چھٹی کر لی تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ یونیورسٹی کے گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ کال ڈسکنیکٹ کر کے وہ جیسے ہی جانے کے لیے مڑا سامنے سے بھاگتے ہوئے عظمیٰ آورش اسی کی طرف آ رہی تھی۔

'پلیز تیمور ہیلپ می۔' وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ تیمور سن سا کھڑا رہ گیا۔ عظمیٰ آورش کی آنکھوں میں آنسو اسے درد دے رہے تھے۔ دل نے خواہش کی کہ وہ اس کے آنسو اپنی پوروں پہ چن لے۔ روتے ہوئے وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ وہ بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ وہ ہڑبڑایا۔

'کیا ہوا عظمیٰ اس طرح سے کیوں رو رہی ہو۔' اور وہ جواب دینے کے بجائے اور شدت سے رونے لگی۔

'ارے کچھ تو بتاؤ ہوا کیا ہے۔'

'وہ با۔ بابا ہاسپٹل میں...... پلیز مجھے ہاسپٹل لے چلیے۔ ڈرائیور بھی آج چھٹی پر ہے۔ پلیز تیمور مجھ پر یہ احسان کرو گے۔' وہ ہچکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

'لیکن انکل کو ہوا کیا ہے۔' وہ فکر مندانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

'پتہ نہیں بابا کے مینجر کا فون آیا تھا انھوں نے بس اتنا بتایا کہ بابا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی اس لیے وہ انھیں اسپتال لے آئے۔'

'اچھا، پلیز پہلے تم رونا بند کرو۔ چلو تم یہاں گیٹ کے پاس آ جاؤ میں ابھی دو منٹ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔' وہ جلدی سے پارکنگ میں سے اپنی گاڑی لے آیا۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور عظمیٰ کو بیٹھنے کے لیے کہا عظمیٰ جلدی سے اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور تیمور اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو رہا تھا۔

'عظمیٰ پلیز رونا تو بند کرو اگر ایسی حالت میں تمھارے بابا تمھیں دیکھیں گے تو ان کو تکلیف ہوگی۔' وہ ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

’اگر انھیں کچھ ہو گیا نا تیمور تو میں زندہ رہ پاؤں گی۔ ان کی وجہ سے تو میری دنیا آباد ہے۔ اے خدا میرے بابا کو جلدی سے ٹھیک کر دو۔‘ وہ تیمور سے کہتے ہوئے اپنے رب سے دعا مانگنے لگی۔

’اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا اکیلا اس بے درد دنیا میں‘۔ وہ عظمیٰ سے کہنے لگا اور وہ جو رونے میں مگن تھی اس کی بات پر جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی جو ڈرائیونگ کرنے میں مگن تھا۔

’وہاٹ ربش کیا کہہ رہے ہو۔‘ وہ رونا بھول کر اس سے کہنے لگی تو تیمور اس کے انداز پر ہولے سے مسکرا دیا۔

’آئی لو یو۔ تیمور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ عظمیٰ کو اس طرح پرپوز کرے گا۔ وہ مورت بنی بس اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔ تیمور ابھی اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہاسپٹل آنے پر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی۔ گاڑی رکتے ہی عظمیٰ ڈور کھول کر ہاسپٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تیمور بھی گاڑی لاک کر کے اندر داخل ہوا اور ریسیپشن پر معظم آفریدی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ریسیپشن پر کھڑی لڑکی نے جہاں معظم آفریدی کی ٹریٹمنٹ شروع تھی روم کا نمبر بتایا اور تیمور جلدی سے اس روم کی طرف بڑھ گیا۔ عظمیٰ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ ابھی تک بے یقین تھی کہ تیمور اس سے محبت کرتا ہے اس کا دل ایک الگ انداز میں دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو خاموش کرتی اپنے بابا کے لیے دعا گو ہو گئی۔ آنسو لڑھک لڑھک کر موتیوں کی شکل میں اس کے عارضوں پر پھسل رہے تھے۔ تیمور ڈاکٹر سے معظم آفریدی کے بارے میں ڈسکشن کرنے لگا۔ ان کی طبیعت خاصی سنبھل چکی تھی۔

’مسٹر تیمور آپ اپنی وائف کو سنبھالیے۔ مسز تیمور آپ کے فادر کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔‘ ڈاکٹر کے اس طرح کہنے پر عظمیٰ ہونق بنی ڈاکٹر کی صورت کو تکے جا رہی تھی اور تیمور لبوں پر مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر انھیں ہزبینڈ اور وائف سمجھ رہا تھا۔ ڈاکٹر وہاں سے چلا تو عظمیٰ آورش جو ہونق بنی کھڑی تھی ایک دم سے تیمور پر برس پڑی۔

’تم نے ان کی غلط فہمی کو دور کیوں نہیں کیا، وہ ہمیں ہزبینڈ اور وائف سمجھ رہے تھے اور تم خاموش کھڑے مسکرا رہے تھے۔‘

’یار ابھی تو تم یہ آنسوؤں کا سمندر بہا رہی تھی اور اب یہ تیور۔‘ وہ شرارت سے گویا ہوا۔

’فضول بکواس مت کرو مجھے بابا سے ملنا ہے‘

’ڈاکٹر نے ابھی انھیں ڈسٹرب کرنے کے لیے منع کیا ہے انھیں ابھی ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ریلیکس ہو کر اس بینچ پر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر سے بات کر کے آتا ہوں۔ انکل انشاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔‘

کتنا اچھا لگ رہا تھا وہ اس طرح بابا کی فکر کرتے ہوئے۔ محبت کتنی خوبصورت ہوتی ہے وہ محبت کرنے والوں سے جڑے رشتوں کو بھی مقدس بنا دیتی ہے اور عظمیٰ آورش سے جڑا ہر رشتہ تیمور اشعر آفندی کے لیے بہت معنی رکھتا تھا۔ وہ دونوں ان سے ملنے روم میں آئے۔ مینجر صاحب آفس واپس جا چکے تھے۔ روم کے اندر قدم رکھتے ہی معظم آفریدی پر نظر پڑنے پر عظمیٰ آورش کی پلکوں سے آنسو کی بوندیں گر کر اس کے دامن میں جذب ہو رہی تھیں۔ ’بابا‘۔ عظمیٰ کے آواز دینے پر معظم آفریدی نے ہولے سے آنکھیں کھولیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہنے لگے۔

’میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا۔ تمھارے یہ آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں‘۔ ان کے اس طرح کہنے پر وہ ان کے سینے پر سر رکھے بے آواز آنسو بہانے لگی۔

عظمیٰ اس طرح مت روؤ۔ انکل دکھی ہو رہے ہیں۔‘ تیمور جو خاموشی سے ان باپ بیٹی کے پیار کو تکے جا رہا تھا کہنے لگا۔ اس کے کہنے پر معظم آفریدی تیمور کو دیکھتے گئے۔ تبھی عظمیٰ نے تیمور کا تعارف معظم آفریدی سے کرایا اور ہاسپٹل تک لانے کے بارے میں بتانے لگی۔ ’شکریہ تیمور بیٹا‘، معظم آفریدی اپنے لہجے میں پیار سموتے ہوئے کہنے لگے۔

’شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ مت کیجیے انکل یہ تو میرا فرض تھا۔‘ معظم آفریدی اسے رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اور پھر دونوں کے درمیان نا ختم ہونے والی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ تیمور نے انھیں ڈسچارج کرا کے گھر تک چھوڑنے کی ذمہ داری ایک بیٹے کی طرح نبھائی تھی اور وہ جب معظم آفریدی کو خدا حافظ کہہ کر ان کے روم سے باہر آیا تو عظمیٰ اس کی ہی منتظر تھی۔ تیمور بے ساختہ مسکرا دیا اور دونوں ہم قدم ہو کر چلنے لگے۔

’Thanks تیمور‘ وہ اس کی آنچ دیتی آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھ نہیں پائی تھی اور گھنی پلکوں کی جھالر جھکا گئی۔ اس کی اس ادا پر تیمور دل و جان سے فدا ہو گیا۔

’Thanks کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تم سے محبت کی ہے تو یہ سب کرنا تو ہوگا۔ پتہ نہیں عظمیٰ تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو لیکن

مجھے یقین ہے کہ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔ کیونکہ تمھیں پتہ ہے عظمیٰ ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس کے دل میں بھی ویسی ہی محبت پنپ رہی ہوتی ہے لیکن یہ اور بات ہے کہ وہ اظہار نہیں کرتا۔‘ وہ آنکھوں میں دنیا جہاں کے سپنے سجائے، ہونٹوں پر پیار بھری مسکراہٹ، آنکھوں میں محبت کے چراغ جلائے براہِ راست اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھنے لگا جو اس کے اظہار پر پزل سی ہو رہی تھی۔

’یار پتہ نہیں مجھے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا۔‘ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

’کس بات کے لیے۔‘ وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

’تمھارے اظہار کے لیے۔ اے خدا جلدی وہ دن دکھا دے جس دن مس عظمیٰ آورش صاحبہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرے گی۔‘ وہ مسکین صورت بنائے کہہ رہا تھا اور اعظمیٰ آورش مسکراتے ہوئے تیمور کو دیکھنے لگی۔

’یار مجھے تو یقین ہی نہیں ہوتا کہ تم وہ ہی عظمیٰ آورش ہو جس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔‘ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

’سچ عظمیٰ محبت انسان کو بدل دیتی ہے، مجھ جیسا مغرور بندہ بھی محبت کے آگے زیر ہو گیا۔ کتنا اچھا لگتا ہے نا محبت کرنا اس سے اور زیادہ اچھا یہ لگتا ہے کہ کوئی ہمیں چاہتا ہے۔ لیکن یار تم تو اپنے منہ سے پھوٹو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں تمھارے منہ سے سننے کا خواہش مند ہوں۔ حالانکہ تمھاری مغرور نیلی آنکھیں سب کچھ عیاں کر جاتی ہے۔‘ وہ شوخی سے کہتے ہوئے مسکرانے لگا۔

’ہمیشہ ایسے ہی مسکراتے رہنا تیمور اشعر آفندی کہ یہ مسکراہٹ تم پر بہت سوٹ کرتی ہے۔‘ عظمیٰ اس سے کہنے لگی اور وہ بس نیلی آنکھوں والی پری کو دیکھتے گیا۔ جو بنا کچھ سوچے اس کے اندر آ بسی تھی جو بے دھڑک اس کے دل کی وادی میں گھوما کرتی۔ جو اس کی زندگی کی مسند پر پورے حق کے ساتھ براجمان ہو چکی تھی۔ ’جو حکم جانِ دل‘ وہ سینے پر ہاتھ رکھے سر جھکائے بہت ہی ادب سے کہہ رہا تھا۔ پھر دونوں کا قہقہہ فضا میں بلند ہوتا گیا۔

ابھی تو بادل امڈ رہے تھے محبتوں کے
صداقتوں کے، عقیدتوں کے
یہ تیرے بچھڑنے کے دن نہیں تھے
تو ایسے بچھڑا کے سارے موسم
اداس لمحوں کی سازشوں میں گھر گئے ہیں
ہمارے جذبات مر گئے ہیں
تو ایسے بچھڑا
بہار رت بھی خزاں جیسی لگتی ہے۔

موسم گزرتے گئے۔ بہاریں آتی تو تیمور اشعر آفندی بھی بہار بن کر عظمیٰ آورش کے اطراف گھومنے لگتا۔ گرما کے موسم میں وہ اس کا سایہ بن جاتا۔ موسم پر لگا کہ گزرتے گئے اور تیمور اشعر آفندی فائنل ایئر میں پہنچ گیا۔ آج ان کی فیئر ویل پارٹی تھی۔ یونیورسٹی کے سبھی اسٹوڈنٹ انوائیٹ تھے۔ آج تیمور اشعر آفندی کے لیے بہت خاص دن تھا۔ آج وہ پوری یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کے سامنے عظمیٰ آورش کو پرپوز کرنے والا تھا۔ فنکشن رات میں شروع ہونے والا تھا۔ تیمور آج بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ بلیک پٹھانی پہنے گلے میں بلیک ہی نیٹ کا خوبصورت سا ڈوپٹا ڈالے بلیک گوگل لگائے بے پناہ ہینڈسم لگ رہا تھا۔ یونیورسٹی پہنچتے ہی اس نے عظمیٰ کو کال ملائی۔

’کہاں ہو یار ابھی تک نہیں آئی ہو۔‘ اس کے لہجے میں بے قراریاں بول رہی تھیں۔

’ہاں بابا بس نکل ہی رہی ہوں تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔‘

’نہیں کر سکتا میں اب اور انتظار تمھیں پتہ ہے آج میرے پاس تمھیں دینے کے لیے ایک سرپرائز ہے۔‘ وہ لہجے میں سسپنس سموئے کہنے لگا۔

’کیسا سرپرائز تیمور جلدی بتاؤ۔‘

’اگر سرپرائز بتا دیا تو کہاں وہ سرپرائز رہ جائے گا بیوقوف تم آؤ تو سہی۔‘ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

’کہیں تمھارے سرپرائز کو سننے سے پہلے میں اس دنیا سے نہ چلی جاؤں۔‘ وہ سنجیدہ لہجے میں کہنے لگی۔

’شٹ اپ، منہ بند رکھو آپ نے آئندہ ایسی بات کہی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا میں آ رہا ہوں تمھیں لینے کے لیے‘ وہ خفا خفا سا کہنے لگا۔

’لیکن میں تو نکل چکی ہوں‘ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

’مگر میں پھر بھی آ رہا ہوں۔‘ وہ کہتے ہوئے اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

سورج دھیرے دھیرے پہاڑوں کے پیچھے چھپنے کے لیے پناہ لے چکا تھا۔ موسم اچانک ہی بدلا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوائیں چل

رہی تھیں شام ڈھل چکی تھی اور رات اپنا ڈیرہ جما رہی تھی۔ اور ایسی ہی بھیانک رات تیمور اشعر آفندی کی زندگی کا حصہ بننے والی تھی جس سے بے خبر وہ اپنے محبوب کے تصور میں گم، مست ہواؤں کے سنگ باتیں کر رہا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ تیمور چوڑی کے باکس کو دیکھ کر مسکرا دیا Transparent باکس میں ہری کانچ کی چوڑیوں کی چھب ہی نرالی تھی اس نے بہت ہی پیار سے یہ چوڑیاں عظمیٰ آورش کے لیے خریدی تھیں وہ چوڑیوں کو دیکھ ہی رہا تھا تبھی اس کے موبائل پر رنگ بجی۔ موبائل کی اسکرین پر My Life لکھا ہوا تھا۔ تیمور مسکرا اٹھا۔

’ہیلو جان دل۔‘ وہ محبت سے کہنے لگا تو عظمیٰ آورش کی کھنکتی ہنسی سنائی دی۔

’ہائے جان ودل کے عاشق‘۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

’کہاں تک پہنچی ہو۔‘ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھنے لگا تو وہ پوائنٹ کا نام بتانے لگی۔

’اچھا مجھے وہاں پہنچنے تک بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔ کاش میرے پر ہوتے تو چند منٹ میں میں تمہارے پاس پہنچ جاتا۔‘ وہ حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ وہ اور بھی کچھ کہنے والا تھا لیکن زوردار دھماکے کی آواز سے ساکت رہ گیا۔

ہیلو عظمیٰ یہ کیسی آواز تھی۔‘ اور ادھر سے جواب ندارد۔

’ہیلو.........ہیلو عظمیٰ کیا ہوا ہیلو.........ہیلو.....‘ وہ دیوانہ وار کہے جا رہا تھا اس کا دل کئی طرح کے وسوسوں میں گھر چکا تھا۔ کئی طرح کی سوچیں سر ابھار رہی تھیں وہ فاسٹ ڈرائیونگ کرتا ہوا اس پوائنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پوائنٹ سے پہلے ہی اس کے پاؤں بریک پر جا پڑے۔ وہ پھٹی پھٹی اور بے یقین آنکھوں سے عظمیٰ آورش کی کار جو پیڑ سے ٹکرا کر اپنی اصلی حالت کھو چکی تھی دیکھنے لگا۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ لیکن عظمیٰ کا خیال آتے ہی زندگی پھر سے دوڑ گئی۔ وہ ڈور کھولتا جلدی سے اس گاڑی تک پہنچا اور ساکت رہ گیا۔ ایک پل کے لیے اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ عظمیٰ آورش خون میں لت پت ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ تیمور پر تو دیوانگی طاری ہو گئی تھی وہ کچھ کر ہی نہیں پا رہا تھا۔

’عظمیٰ.........عظمیٰ.........وہ اس کو باہر نکالتے ہوئے آواز دینے لگا۔ اس کے ماتھے پر بہہ رہے خون پر اس کا نیٹ کا ڈوپٹہ باندھا جو خون کے بند باندھنے کے لیے ناکافی تھا۔ وہ اس کو لیے نیچے بیٹھتا چلا گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے آواز دینے لگا۔

’عظمیٰ پلیز آنکھیں کھولو.........یہ کیا ہو گیا عظمیٰ آنکھیں کھولو‘ وہ لرزتے لہجے میں کہنے لگا۔ اس کا آنسو عظمیٰ کے رخسار پر گرا تو عظمیٰ ہوش کی دنیا میں لوٹی۔

’ت.........ت......تیمور‘ وہ اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہنے لگی جیسے اس کے ہونے کی تصدیق کرنا چاہتی ہو۔

’ہاں عظمیٰ میں تمہارا تیمور‘ وہ اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہنے لگا۔ ’تمہیں کچھ نہیں ہوگا عظمیٰ میں تمہیں ابھی ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔‘

’نہیں تیمور نہیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ م......میں تمہاری بانہوں میں مرنا چاہتی ہوں۔‘ وہ بہت ہی مشکل سے جملہ ادا کر پائی۔ بہت ساری گہری چوٹیں اسے آئی تھیں۔ وہ خون میں پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ وہ بلیک فراک میں بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

’نہیں عظمیٰ میں ایسے نہیں ہونے دوں گا تمہیں کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا میں ابھی ڈیڈی کو کال کرتا ہوں ہم جلد ہی ہاسپٹل پہنچ جائیں گے چلو‘ وہ اسے بانہوں میں اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ عظمیٰ کے جملے پر ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔

’ک.......ک......کیا میں لا.........لائق بھی نہیں ہوں کہ تمہاری با.........بانہوں میں اپنا دم توڑ سکوں‘ وہ درد کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔

’ت......تم مجھے وہ سرپرائز بتاؤ ج......جو تم مجھے دینا چاہتے تھے۔‘

وہ ناہموار سانسوں کے درمیان کہنے لگی تو تیمور پاس پڑے باکس میں سے چوڑی نکال کر اسے دکھانے لگا۔

’اسے م.........میری کلائیوں میں پہناؤ ت......ت.....تیمور‘ اور تیمور نم آنکھوں سے چوڑیاں اس کی کلائیوں میں پہنانے لگا۔ ’تمہیں کانچ کی چوڑیاں بہت پسند ہے نا عظمیٰ دیکھو میں نے تمہاری کلائیوں کو ان کانچ کی چوڑیوں سے سجا دیا‘ وہ روتے ہوئے کہنے لگا۔ پھر اسے بانہوں میں اٹھانے لگا تبھی عظمیٰ نے اس کی کوشش کو ناکام کر دیا۔

’کیوں ضد کر رہے ہو تیمور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ سرپرائز دینے کے لیے بہت شکریہ۔‘‘ وہ چوڑیوں سے بھری کلائیوں کو دیکھنے لگی۔

’ضد تو تم کر رہی ہو عظمیٰ‘

’کیونکہ میں جانتی ہوں تیمور کے مجھے اب خالق حقیقی سے ملنے

سے یہ ڈاکٹر نہیں روک سکتے۔'

'نہیں عظمیٰ' تیمور تو تڑپ تڑپ گیا۔

'تیمور۔ت...... تمھیں ہمیشہ مجھ سے شکایت تھی نہ کہ م......میں اظہار محبت نہیں کرتی۔......ت......تیمور تمھیں پتہ ہے میں تم سے بے پناہ محبت کرتی۔ جس طرح......چ......چاند اپنی روشنی سے محبت کرتا ہے۔ ج......ج......جس طرح سورج اپنی کرنوں سے محبت کرتا ہے۔ یہ ستارے آسمان سے جیسی۔م.........محبت کرتے تھے۔ محبت کی پری مجھ پر بھی......م...... مہربان ہوگئی تھی۔ اپنی ہر دعا میں میں نے تمھیں اور بس تمھیں ہی مانگا ہے۔ تیمور تم ہی سے......م......میری زندگی کے رنگ خوبصورت ہوئے لیکن یہ ر......رنگ...... میں زیادہ نہیں دیکھ پائی مگر میری یہ د......دعا قبول ہوگئی کہ میں تمھاری بانہوں میں اپنا دم توڑوں۔'' آئی لو یو تیمور۔'

'می ٹو عظمیٰ' کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کے اظہار پر خوشی سے جھوم اٹھتا لیکن وہ اپنے حواس کھو رہا تھا۔

'مجھے پتا ہے عظمیٰ کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو تمھاری آنکھوں میں جلتی ہوئی شمعیں تمھاری محبت کا پیغام بہت آسانی سے مجھ تک پہنچا دیتی تھی۔' وہ بکھرے ٹوٹے لہجے میں کہنے لگا۔

'م......م...... مجھے ہمیشہ اپنے دل میں آباد رکھنا تیمور ہمیشہ مجھے اپنی زندگی میں یاد رکھنا مجھے کبھی نہ بھلانا تیمور کوئی خطا ہو ہو تو ......م......م معاف کرنا الوداع زندگی۔' کہتے ہوئے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اور تیمور کو تو ایسا لگا جیسے اس کی سانسیں چھین لی گئی ہوں۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ عظمیٰ نے اس سے محبت کا اظہار کیا بھی تو کب جب وہ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔

'عظمیٰ' وہ آسمان کی طرف سر اٹھائے چیخنے لگا اس کی آواز پر زمین، آسمان بھی آزردہ ہوگئے۔ وہ عظمیٰ آورش کو سینے سے لگا کے بے تحاشہ رونے لگا۔

'عظمیٰ تم مجھے ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی نہ اب تم ہی نہیں تو مسکرانا کیسا۔ اب میرے لب مسکرانے کے لیے ترس جائیں گے۔' وہ اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیے کہنے لگا۔ تیمور ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوکر بکھر رہا تھا۔ بارش بھی اس کے غم میں شریک ہو گئی۔ پانی کی بوندیں اسے بھگو رہی تھیں۔ پانی کی بوندیں بھی تیمور اشعر آفندی کے غم پر غمزدہ ہوگئی تھیں۔ بارش تیمور اور عظمیٰ کو بھگو رہی تھی۔ دل کا درد تیمور کے دل کو رلا رہا تھا۔ اندھیری رات بھی اس کی محبت کے بچھڑ جانے کا ماتم منا رہی تھی۔ تیمور نے جس سے بے تحاشا بے حساب محبت کی تھی جسے اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے تھا جسے اس نے دل کی دھڑکن بنا کر سینے میں چھپا رکھا تھا۔ جو اس کے اندر لہو بن کر زندگی کی نوید دیتا تھا وہ آج اس سے بچھڑ گیا تھا جس کے بنا زندگی کا ایک پل بھی گزارنا مشکل تھا۔ جس کی دوری اک پل بھی گوارہ نہ تھی اس کے بنا پوری زندگی گزارنا تیمور کے لیے بے حد مشکل تھی۔ عظمیٰ آورش اسے تنہائی سونپ کر جا چکی تھی۔ تنہائی کا احساس ہمیشہ جان لیوا ہوتا ہے۔ آرزؤں کے ساحل درد کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب چکے تھے۔ اداسی کے سائے تلے وہ عظمیٰ آورش کے ساتھ بیتے مسکراتے، رلاتے پلوں کے سنگ سفر کرتا حال کی رہ گزر میں آ پہنچا۔ آنکھ سے آنسو کے موتی اس کی ہتھیلی میں جذب ہوگئے۔ وقت تیمور اشعر آفندی کو بہت ہی گہرا زخم دے کر چل پڑا تھا۔ وہ ساری زندگی عظمیٰ آورش کی یادوں کے ساتھ بتانا چاہتا تھا لیکن ماں کی ممتا کے آگے مجبور ہو کر اس نے کرن سے شادی تو کر لی تھی لیکن آج بھی اس کی زندگی عظمیٰ آورش کی یادوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ اتنے برس بعد بھی وہ عظمیٰ آورش کو اسی طرح محبت کرتا تھا۔ زندگی کی یہ کٹھن راہ اس نے عظمیٰ کی یادوں کے سنگ گزارنی تھی۔ محبت میں ملی تنہائیوں میں تیمور اشعر آفندی کو زندگی کا یہ تکلیف دہ سفر اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

وہ کیا بچھڑا مجھ سے میرا صنم
ہر سو چھا گئی ویرانیاں
درد دل کے ساتھ میں
جی رہا ہوں یار یہاں
ہر طرف اسی کی یاد ہے
خاموش زباں پر ذکر اسی کا
یاد جب وہ آتا ہے
دل میرا جائے سسک
جینے نہ دے یہ روزی
بھولی ہوئی یادوں کی کسک

□□□

Rizwana Sagar Rozi
D/o. SK. Bilal Sagar
Hirapura, Near Masjid Darus Salam
A.C. Fruit Comapny, Achalpur City
Dist. Amravati-444806 (M.S)

سریتا جین

غزلیں

پینترے جب ہوا کے چلتے ہیں
سب دیے لڑکھڑا کے چلتے ہیں

ان کو بھی آئینے کی عادت ہے
جو مکھوٹا لگا کے چلتے ہیں

آسماں دیکھنے لگا ہے ہمیں
ہم بھی اب سر اٹھا کے چلتے ہیں

پھول آباد ہوں زمانے میں
یہ سبھی کو ہنسا کے چلتے ہیں

کتنے بے درد ہے وہ نشتر جو
مسخروں کو رلا کے چلتے ہیں

ان کو اونچا مقام ہے حاصل
ہاں میں جو ہاں ملا کے چلتے ہیں

راہ ایسی ہے ان شہیدوں کی
پھول خود کو بچھا کے چلتے ہیں

دیش پر جب بلا کوئی آئے
ہم لہو بھی بہا کے چلتے ہیں

سر پہ سودا سوار کرنا تھا
ہم کو بھی دشت پار کرنا تھا

گر ہنر تھے تمھارے ہاتھوں میں
شعلے کو آبشار کرنا تھا

پہلے سورج بناتے خود کو ہم
پھر اندھیروں پہ وار کرنا تھا

دھوپ سے اس لیے غرض تھی ہمیں
اپنا سایہ فرار کرنا تھا

ہجر میں جاں گنوانے والے تھے
اور کچھ انتظار کرنا تھا

شوق سے ہی لگاؤ تھا ہم کو
شوق ہی درکنار کرنا تھا

اتنی وسعت کا کیا کرے گا وہ
آسماں کو وچار کرنا تھا

ملتا ہے سب سے ہنس کے وہ سریتا
بس ہمیں اشکبار کرنا تھا

Sarita Jain
Ratan Prakash, F-278-A,
Street no. 21,Near AVB school
Laxmi Nagar, Delhi-92

نظمیں

آبگینہ عارف

پتھر

وہ جو راستے کے پتھر تھا
اس کی آنکھیں نکال لیں میں نے
اب وہ مجھ میں زندہ ہے
وہ نفرت زدہ آنکھیں
اب میرے دل میں
ڈر ڈر کے
رُک رُک کے
دھڑکتی ہیں
آپ سوچتے ہوں گے
کیوں کر ایسا کیا میں نے
پتھر ہٹا دیا
آنکھیں نکال لیں
اس لیے کے وہ پتھر اندھا ہو جائے
اس کی آنکھیں میرے اندر
شاید تھوڑا بدل جائیں
اور گناہ اس کے
اشک بن کر بہہ جائیں
اس کو زندہ ہونے کے لیے
ایک پاکیزہ جسم کی ضرورت تھی
اس لیے یہ کیا میں نے

دیوار

میں اُس دیوار کو
ہر لمحہ زندہ پاتی ہوں
کہ اس میں موجود آنکھیں
مجھے..........!
بس مجھے دیکھتی رہتی ہیں
اور وہ لب مجھ سے
کچھ کہنا چاہتے ہیں
کبھی کبھی اس کی باہیں جکڑ لیتی ہیں مجھے
اور
میں گھبرا کر
راہِ فرار اختیار کرتی ہوں
میرے رونے سے
اس میں بھی سیلن آتی ہے
بہت کوششوں سے
اَن سُنا کیا ہے اُسے
وہ مجھے پھر بھی سنائی دیتی ہے
وہ ایک لڑکی جو دیوار کے
اس طرف ہے
میں اسے آزاد
کرنا چاہتی ہوں

Aabgina Arif
C-5, Third Floor
Okhla Village
New Delhi-110025

پروین ام مشتاق

غزل

نہ آیا کر کے وعدہ وصل کا اقرار تھا کیا تھا
کسی کے بس میں تھا مجبور تھا لاچار تھا کیا تھا

برا ہو بد گمانی کا وہ نامہ غیر کا سمجھا
ہمارے ہاتھ میں تو پرچۂ اخبار تھا کیا تھا

صدا سنتے ہی گویا مردنی سی چھا گئی مجھ پر
یہ شور صور تھا یا وصل کا انکار تھا کیا تھا

خدا کا دوست ہے تعمیر دل جو شخص کرتا ہو
خلیل اللہ بھی کعبہ کا اک معمار تھا کیا تھا

نہ آئے تم نہ آؤ میں نے کیا کچھ منتیں کی تھیں
تمہیں نے خود کیا تھا عہد یہ اقرار تھا کیا تھا

ہوا سے جب اڑا پردہ تو اک بجلی سی کوندی تھی
خدا جانے تمہارا پرتو رخسار تھا کیا تھا

ملا تو ہم سے محفل میں جو شب کو غیر کیوں بگڑا
ترا حاکم تھا ٹھیکا دار تھا مختار تھا کیا تھا

مری میت پہ ماتم کرتے ہو اللہ رے چالاکی
خبر ہے خود تمہیں مدت سے میں بیمار تھا کیا تھا

ہزاروں حسرتیں بیتاب تھیں باہر نکلنے کو
وہ سوتے میں بھی پرویںؔ فتنۂ بیدار تھا کیا تھا

پونم یادو

غزل

بے نیازی کے سلسلے میں ہوں
میں کہاں اب ترے نشے میں ہوں

ہجر تیرا مجھے ستاتا ہے
اور باقی تو بس مزے میں ہوں

ڈھونڈھ مت ان اداس آنکھوں میں
غور کر تیرے قہقہے میں ہوں

وہ مجھے اب بھی چاہتا ہوگا
میں ابھی تک مغالطے میں ہوں

ہر طرف محفلیں خیالوں کی
عشق کے شاہی محکمے میں ہوں

توڑ کر ہی نکال لے کوئی
قید میں اپنے دائرے میں ہوں

اس کو منزل بھی مل گئی اپنی
اور میں ہوں کہ راستے میں ہوں

لذیذ پکوان

پھینی

اجزا: گھی آدھا کلو، یونی پف آدھا کلو

ڈو کے لیے:

میدہ آدھا کلو، پانی ایک کپ یا حسب ضرورت، تیل فرائی کرنے کے لیے

ترکیب: گھی اور یونی پف کو پین میں دس منٹ گرم کریں۔ پھر ایک گھنٹہ ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیں تاکہ مکھن تیار ہو جائے۔

نوٹ: اگر مکھن سخت ہو جائے تو تھوڑا آئل ڈال کر مکھن کو نرم کر لیں۔

ڈو کے لیے: میدے میں ایک کپ پانی ڈال کر ڈو گوندھ لیں۔ پانی کم یا زیادہ استعمال کیا جا سکتا ہے بس ڈو کو نرم ہونا چاہیے۔ پھر ڈو کو ہاتھوں کی مدد سے گولائی میں ڈونٹ کی شکل میں گھمائیں۔ اب اس پر مکھن لگائیں اور بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر ہاتھوں سے گولائی میں اس طرح رول کریں کہ چار گول رولز بن جائیں۔ اب رولز کو پیڑے کے سائز میں کاٹ لیں۔

پھر اس کے پراٹھے کے پیڑے کی طرح کے پیڑے بنا لیں اور ایک گھنٹے کے لئے چھوڑ دیں۔ پھر ہاتھوں سے بیل لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں پھینی ڈال کر فرائی کر لیں۔ گرم دودھ میں ڈال کر سرو کریں۔

پوری

اجزا: آٹا ایک پاؤ، لال آٹا ایک پاؤ، نمک ایک چائے کا چمچ، پانی گوندھنے کے لیے، تیل فرائنگ کے لیے

ترکیب: پہلے آٹا اور نمک کو ملا کر پانی سے گوندھیں اور دو سے چار منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب ان کے پیڑے بنا کر دوبارہ چار سے پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر ان کی پوریاں بیلیں اور تیل میں فرائی کر لیں۔

بادامی دودھ جلیبی

اجزا: جلیبی آدھا کلو، دودھ ایک لیٹر، زعفران آدھا چائے کا چمچ، چینی حسب ضرورت، الائچی پاؤڈر ایک چوتھائی چائے کا چمچ،

(انڈے کی سفیدی دو عدد) پھینٹی ہوئی، کھویا ایک کپ، بادام ایک سو گرام

ترکیب: ایک پین میں دودھ، زعفران، چینی اور الائچی پاؤڈر ڈال کر ہلکی آنچ پر پکالیں۔ جلیبیوں کو چوڑے پیندے والی ڈش پر پھیلا دیں اور اوپر پکا ہوا دودھ ڈال دیں۔ پھر اوپر انڈے کی سفیدی، کھویا اور بادام ڈال دیں۔ اب اسے پندرہ سے بیس منٹ کے لئے ایک سو اسی ڈگری سینٹی گریڈ پر بیک کرلیں۔ مزیدار بادامی دودھ جلیبی تیار ہے۔

مصالحے دار چاٹ

اجزا: سفید چنے ایک کپ، املی کا پیسٹ چار کھانے کے چمچ، پانی ایک کپ، تیل دو کھانے کے چمچ، (زیرہ آدھا چائے کا چمچ (ثابت پیاز ایک عدد باریک کٹی ہوئی، لہسن جوئے دو عدد، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا

(ہری مرچ دو عدد (کٹی ہوئی، (کشمیری لال مرچ دو عدد ثابت زیرہ ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا، (دھنیا ایک چائے کا چمچ (پسا ہوا، ہلدی ایک چوتھائی چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، (ٹماٹر دو سو گرام (کٹے ہوئے گرم مصالحہ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، کری پتے آٹھ عدد، چینی ایک چائے کا چمچ، پاپڑی گارنشنگ کے لیے، (ہرا دھنیا گارنشنگ کے لیے (کٹا ہوا، پیاز گارنشنگ کے لئے، ہری مرچ گارنشنگ کے لیے۔

ترکیب: املی کے پیسٹ کو پانی میں ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے ابال لیں یہاں تک کہ آدھا کپ پانی رہ جائے۔ ایک پین میں تیل گرم کر کے اس میں کری پتے، کشمیری لال مرچ اور زیرہ ڈال کر دو منٹ کے لیے فرائی کرلیں۔ پھر پیاز، لہسن اور ادرک ڈال کر مزید دو منٹ فرائی کرلیں۔ ہری مرچ شامل کر کے کچھ دیر کے لئے فرائی کریں۔ پھر پسا دھنیا، پسا زیرہ، ہلدی پاؤڈر اور نمک ڈال کر تین سے چار منٹ کے لئے فرائی کرلیں۔ پھر ٹماٹر ڈال کر ایک ابال آنے تک پکائیں۔ اب چنے، تمام مصالحہ پاؤڈر، املی کا پانی اور چینی ڈال دیں۔ پھر ڈھانپ کر پانچ سے سات منٹ کے لئے دم پر رکھ دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ پھر پاپڑی، ہرا دھنیا، پیاز اور ہری مرچ سے گارنش کر کے سرو کریں۔

بٹاٹا وڑا

اجزا: آلو آدھا کلو، (ہری مرچ چار عدد باریک کٹی ہوئی، (ادرک ایک چائے کا چمچ باریک کٹی ہوئی (پیاز آدھا کپ باریک کٹی ہوئی، (لال مرچ آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی، (ہرا دھنیا چار کھانے کے چمچ باریک کٹا ہوا، لیموں کا رس دو کھانے کے چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ

ترکیب: پہلے آلوؤں کو اُبال کر ان کے چھلکے اُتاریں اور میش کرلیں۔ اب ایک پیالے میں ہری مرچ، ادرک، پیاز، پسی لال مرچ، ہرا دھنیا اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور اس کی چھوٹی چھوٹی بالز بنائیں اور رکھ دیں۔ بیٹر کے لئے: ایک پیالے میں بیسن، پانی، نمک اور پسی لال مرچ ڈال کر بیٹر بنائیں اور تیار بالز کو اس میں ڈپ کریں اور ڈیپ فرائی کرلیں، یہاں تک کہ وہ لائٹ گولڈن ہوجائیں۔

اب انھیں تیل سے نکال کر املی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

□□□

صحت مند بننے کے لیے کیجیے 13 تبدیلیاں

انسان اگر چربی، پروٹین مواد سے بھرپور غذا کھائے، تو اس کی آنکھوں کے آنسوؤں میں کولیسٹرول آنے لگتا ہے۔ اگر آپ کنٹیکٹ لینز پہنتے ہیں، تو یہ کولیسٹرول ان پر دھندلا غبار جما دیتا ہے۔ ذرا سوچیے، زائد کولیسٹرول کنٹیکٹ لینز برباد کرڈالتا ہے، تو آپ کی شریانوں میں تو تباہی مچاتا ہوگا۔

خشک برش سے دانت صاف کریں اس طریقے پر عمل کرنے سے دانتوں پر جما میل 60 فیصد صاف ہوجاتا ہے، نیز مسوڑھوں سے خون بہنے کا خطرہ بھی کم ہوتا ہے۔ دانتوں کا اندرونی و بیرونی حصہ نرم بالوں والے سوکھے برش سے صاف کیجیے۔ پھر کلی کیجیے، تھوکیے اور برش دھو کر کچھ دیر ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کریں۔

ناشتا کبھی نہ چھوڑیے آسٹریلوی سڈنی یونیورسٹی کے محققوں نے ایسے پانچ سو مرد و زن پر نظر رکھی جنھوں نے اپنا 15 سے 25 کلو وزن کم کیا اور پھر پانچ برس تک خود کو اسمارٹ رکھا۔ اس تحقیق سے انکشاف ہوا کہ ان لوگوں میں 80 فیصد ہفتے کے تمام دن ناشتا کرتے تھے۔

ہفتے میں ایک بار مچھلی کھائیے وجہ یہ ہے کہ یہ عمل انسان کو دل کے دورے سے بچاتا ہے۔ دراصل مچھلی میں وافر موجود اومیگا 3 فیٹی ایسڈ قلب کو تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ غذائی تیزاب یا ایسڈ چکنی مچھلیوں میں زیادہ ملتے ہیں۔

روزانہ وٹامن ای اور اسپرین لیجیے ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ ضدِ تکسید اور خون پتلا کرنے والی دوا کا یہ مرکب انسانی شریانوں میں جما مواد 80 فیصد تک گھلا دیتا ہے۔ یہ دونوں ساتھ لینے کا فائدہ اتنا زبردست ہے کہ اگر مرد و زن اپنا کولیسٹرول کم نہ بھی کرسکیں، تو یہ طریق علاج ان کی

شریانوں میں چربی جمنے نہیں دیتا۔

دکھی انسانیت کی مدد کیجیے جو لوگ ہفتے میں کم از کم ایک دن رضاکارانہ سرگرمی انجام دیں، وہ دل کا سکون پاتے ہیں۔ یہی نہیں، دوسروں کی نسبت ان میں موت کا خطرہ 50 فیصد تک کم ہو جاتا ہے۔

پیٹ کی ورزش کریں ڈاکٹروں نے تجربات سے جانا ہے کہ اگر انسان اپنے پیٹ کے عضلات مضبوط کرلے، تو درد کمر اسے تنگ نہیں کرپاتا اور عضلات قوی کرنے کا بہترین طریقہ پیٹ کی ورزشیں ہیں۔ ماہرین نے اس ضمن میں کرنچ کو مؤثر ورزش قرار دیا۔ کرنچ انجام دینے کا طریقہ یہ ہے کہ کمر کے بل لیٹیے۔ گھٹنے اوپر کیجیے۔ پھر دونوں بازو گھما کر گردن پکڑیے۔ اس کے بعد بالائی دھڑ جتنا اوپر اٹھا سکتے ہیں، اٹھائیے۔ اس دوران نچلے حصے میں جنبش نہیں ہونی چاہیے۔ روزانہ یہ ورزش بارہ تیرہ بار کیجیے۔

کافی: بس ایک پیالی کافی کے شوقین یہ مشروب پینے پر آئیں، تو کئی پیالیاں چڑھا جاتے ہیں۔ حالانکہ کافی کی فی پیالی دل کی 16 دھڑکنیں فی منٹ بڑھا دیتی ہے۔ لہٰذا پرہیز نہ کرسکیں، تو ایک پیالی کافی ہی نوش کریں۔

شادی کا بندھن محفوظ رکھیے میاں بیوی میں محبت اور گھر میں افہام و تفہیم کا ماحول بھی کو صحت مند رکھتا ہے۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ گھر میں ناراضگی و لڑائی جھگڑا رہے، تو بیمار ہونے کا خطرہ 35 فیصد تک بڑھ جاتا ہے جبکہ عمر بھی اوسطاً چار برس کم ہو جاتی ہے۔

ڈپریشن کو ورزش سے گھٹائیے آج کی تیز رفتار زندگی میں انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ذہنی و جسمانی دباؤ کا شکار بن جاتا ہے۔ کئی مرد ادویہ کھا کر ڈپریشن ختم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ تاہم ورزش اس خلل کا بہترین قدرتی علاج ہے۔ ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ روزانہ 40 منٹ ورزش کیجیے تو ڈپریشن آپ کے نزدیک نہیں پھٹکے گا۔ درحقیقت باقاعدگی سے ورزش کا اثر پروزیک (اینٹی ڈپریسنٹ) دوا لینے جیسا ہے۔

تکیے پر کتاب رکھیے جی ہاں، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا آپ کا تکیہ صحیح طرح سر اور گردن کو سہارا دیتا ہے۔ طریقے کار یہ ہے کہ تکیہ دوہرا کر کے اس کے اوپر کتاب رکھیے۔ اگر تکیہ واپس سیدھا ہو جائے، تو وہ ٹھیک ہے نہ ہو، تو تکیہ بدل دیجیے۔

کئی مرد رات کے ایک دو بجے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ پھر انھیں نیند نہیں آتی اور وہ کروٹیں بدلتے ساری رات گزار دیتے ہیں۔ یہ خلل اس طریقے سے دور کیجیے جو یورپی ڈاکٹر اکثر تجویز کرتے ہیں۔ طریقہ عمل یہ ہے کہ اگر آپ جلد اٹھ بیٹھیں، تو ایک تولیہ پانی میں بھگوئیے، پھر بازو، ٹانگوں اور بالائی جسم پر ہولے ہولے تولیہ پھیریے۔ بعد ازاں بستر پر لیٹ جائیے۔

انسان جب نیند سے جاگے تو اس کا جسم بڑا گرم ہوتا ہے۔ بستر میں دوبارہ لیٹنے سے وہ مزید گرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تب گہری اور میٹھی نیند آتی ہے۔

بچوں کو سردی سے کیسے بچائیں

نزلہ، زکام، گلے کی خراش، نمونیہ، بخار وغیرہ اس موسم میں بچوں کے لیں عذاب بن جاتا، سب سے پہلے تو کوشش یہ کرنی چاہیے کے ان کو ٹھنڈے پانی سے بچائیں، کیونکے بچے اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کے اس موسم میں وہ سب چیزیں ان کی صحت کے لیں نقصان دے ہیں جو گرمیوں میں مزہ دیتی تھیں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو سب سے پہلے سردی

کا حملہ نزلے، گلے کی خرابی کی صورت میں ہوگا، جو بچوں کے لیں بہت ہی تکلیف دے ہوتا اور بچے چڑچڑے ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ سے نیند بھی پوری نہیں ہوتی، سب سے پہلے ان کے لیے گرم کپڑوں کا انتظام کریں، سر اور پاؤں کو ضرور کور کر کے رکھیں، اور سینے کے اندر گرم بنیان ضرور پہنائیں، سوپ اور یخنی کا استمال زیادہ کر دیں، ڈرائی فروٹ کی عادت ڈالیں ان سے ذہن بھی تیز ہوتا ہے اور جسم میں بیماری سے مقابلہ کرنے کی طاقت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اگر زکام ہو جائے تو ان کو ہلکا گرم پانی پلائیں، اور دودھ میں چھوارے ابال کر پلائیں،، بچوں کو سرسوں یا زیتون کے تیل کی مالش کریں اور تھوڑی دیر دھوپ میں ضرور بیٹھیں، چھوٹے بچوں کو کھانسی ہو تو چھوٹی الائچی پیس کر چٹا دیں، انڈے بھی جسم میں گرمی پیدا کرتے ہیں انڈے کی زردی میں کھانسی کی صورت میں شہد ملا کر کھلائیں،

ذرا سی گلیسرین شہد دودھ میں شامل کر کے پینے سے بھی انشااللہ فایدہ ہوگا اور یہ ہمارا خود آزمایا ہوا نسخہ ہے کے نیم گرم پانی میں شہد ملا کے پینے سے کھانسی اور نزلہ میں بہت فایدہ ہوتا ہے۔

حسن کی نگہداشت

چہرے کے لیے کونسا فیش واش استعمال کریں

چہرہ دھونے کے لیے اگر صابن کا انتخاب کرنا ہو تو موئسچرائزر اور گلیسرین کے اجزاء والے صابن کا انتخاب کریں۔ کچھ صابن جلد کی نمی کو زائل کر دیتے ہیں۔

فومنگ کلینزر سے بھی آپ کی جلد کو فائدہ اور نقصان دونوں ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ جلد کی نمی کو رفع نہیں کرتا تب بھی اس کا استعمال جاری رکھنا چاہیے۔

یاد رہے کہ کچھ کیمیائی اجزاء قدرتی نمی کو زائل کر دیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے آپ کے لیے کونسا فومنگ کلینزر موزوں ہے یہ آپ کی بیوٹیشن بتا سکتی ہے۔ خاص کر وہ جو آپ کا فیشل کرتی ہو۔

روغنی جلد کی حامل خواتین کو ایسے فیس واشز کا انتخاب کرنا چاہئے جن میں دو مخصوص اجزاء سیلی سائی لیک ایسڈ اور بنزوئیل پروکسڈ موجود ہوں جو جلد کی گہرائی تک صفائی کر کے مساموں کو بند کر دیں۔

چہرے کی جلد کو نم کرنے کے لیے اچھی ساکھ رکھنے والی کمپنی کا تیار کردہ موئسچرائزر لگانا اشد ضروری ہے۔ اس طرح جلد ہائیڈریٹ ہو جاتی ہے۔ اچھا موئسچرائزر یعنی طاقتور اجزا پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔

ہر ایسی خاتون جو عمر کے 30 ویں عشرے میں داخل ہو رہی ہوں وہ اینٹی ایجنگ کریموں کا استعمال شروع کر دیں۔

روزانہ ہماری جلد کئی قسم کی آلودگیوں اور مضر صحت کیمیائی مادوں کے اثرات جھیلتی ہے۔ اس لیے کلینزنگ ملک یا سادہ پیٹرولیم جیلی سے چہرے، گردن، بازو پیر اور ہاتھوں کی صفائی کرنا ہے۔

اس کے بعد پیل آف ماسک یا ملتانی مٹی کا ماسک گھر پر آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

کاجل آئی میک اپ

کاجل، ہر زمانے میں مقبول رہا ہے۔ عرصہ دراز سے خواتین، کاجل کا استعمال کرتی رہتی ہیں۔ قدیم تہذیب میں بھی اس کے استعمال کا

ذکر موجود ہے۔ 70 کی دہائی کی فلموں میں بالی ووڈ کی ہیروئینیں کاجل کے ساتھ دیکھی گئی ہیں۔ کاجل، آنکھوں کی خوبصورتی میں اضافہ کا کام کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کے دل میں بسنے کیلئے آنکھوں کا خوبصورت ہونا بہت ضروری ہے۔ کاجل، آنکھوں کی خوبصورتی میں اضافہ اور اس کو پرکشش بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کاجل آنکھوں کو رعنائی بخشتا ہے اور اسے جاذب النظر بھی بناتا ہے۔ آئی میک اپ میں کاجل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کاجل کی باریک لکیر نہ صرف خوبصورت آنکھوں کو نمایاں کرتی ہے بلکہ یہ آپ کے چہرے کو چمک اور رونق بھی بخشتی ہے کاجل کا استعمال مختلف امراض کے علاج میں بھی کیا جاتا ہے۔ کاجل لگانے سے آنکھیں نرم تاثر دیں گی بلکہ چہرہ بھی خوشنما دکھائی دینے لگے گا۔ کاجل لگانے سے قبل آنکھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں تاکہ پلکوں اور آنکھوں کے اطراف کی گرد صاف ہوجائے۔ آنکھوں کے اطراف جلد خشک ہے تو آپ موئسچرائزنگ لوشن لگائیں یا اس لوشن سے آنکھوں کے اطراف ہلکا مساج کریں۔ اس کے خلاف آپ کی جلد روغنی ہے تو آپ اس شکایت کو دور کرنے کیلئے پاوڈر بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ بازار میں کاجل کے مختلف برانڈس دستیاب ہیں مگر معیاری کاجل ہی خریدیں یا پھر گھر میں کاجل بنائیں۔ غیر معیاری اور سستا کاجل قطعی استعمال نہ کریں اس سے آئی انفیکشن کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں نیم لہسن کا کاجل تیار کرنے کا فن جانتی ہیں۔ بہتر رہے گا کہ بڑی اور معمر عورتوں سے کاجل بنوالیں۔ نیم کے پھولوں سے تیار کردہ کاجل آنکھوں کی صحت کیلئے بہتر مانا جاتا ہے زچہ اور بچہ دونوں کو یہی کاجل تجویز کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کاجل سازی کے طریقہ سے واقف نہیں ہیں تو یہ منصوبہ ترک کردیں بازار سے معیاری کاجل خرید کر اسے استعمال کریں۔

گرمیوں میں میک اپ کا استعمال کیسے کریں

چاہے گرمی ہو یا سردی خواتین میک اپ کا استعمال ترک نہیں کرتیں گرمی کا موسم شروع ہوتے ہی مختلف جلدی بیماریاں جنم لیتی ہیں جس کی زیادہ تر وجہ زیادہ مقدار میں استعمال کیا جانے والا میک اپ ہے گرمیوں کے دنوں میں بھی لڑکیاں خوبصورت پرکشش اور سٹائلش نظر آنا چاہتی ہیں مگر گرمیوں کے موسم میں جلد کھردری خشک اور روکھی ہوجاتی ہے اور اس زیادہ مقدار میں میک اپ زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں خواتین کو سٹائلش رکھنے کے لئے آج ہم چند میک اپ ٹپس بتائیں گے جن کے استعمال لاتے ہوئے خواتین گرمی میں بھی پرکشش نظر آئے گی۔ دودھ ایک قدرتی کلینزر ہے جس کے کوئی سائیڈ ایفکیسٹ نہیں ہوتے۔

پرائمر کا استعمال کیسے کیا جائے: میک اپ کرنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہوتا ہے پرائمر کا استعمال جو کہ آپ کی سکن کو فریش لک دیتا ہے چھوٹی مقدار میں پرائمر لیں اور چہرے پر لگائیں پرائمر کو ایک معیاری برش کی مدد سے بھی چہرے پر لگایا جاسکتا ہے۔ گرمیوں میں جلد سوکھی کھردری اور خشک ہوجاتی ہے اس لئے ہلکے میک اپ کا استعمال کرنا چاہئے۔

ہمیشہ ہلکے میک اپ کا استعمال کریں:

جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ فاؤنڈیشن ہمیشہ ہیوی میک اپ کے لے استعمال کیا جاتا ہے مگر گرمی کے دنوں میں ہلکے میک اپ کا استعمال کرنا چاہیے اس مقصد کے لئے ایک معیاری موئسچرائزر کا استعمال کرنا چاہیے جو کہ آپ کی جلد کو صاف اور واضح کردے۔

آنکھوں کا میک اپ: گرمیوں میں ہیوی میک اپ پسینے کی وجہ سے اتر جاتا ہے جو کہ آنکھوں کے گرد بے ڈھنگا لگتا ہے اس لئے فاؤنڈیشن کا استعمال ترک کرتے ہوئے آنکھوں پر صرف ایک رنگ کا آئی شیڈ لگائیں جو کہ گرمی کے دنوں میں موزوں رہے گا اور بھدا بھی معلوم نہ ہوگا۔ میک اپ میں لائنر کا استعمال ضروری ہے۔

ایک معیاری لائنر صحت مند اور گلوئنگ سکن کو آلٹرنیٹ کرتا ہے اور لائنرز زیادہ تر گالوں اور آنکھوں کے نیچے استعمال ہوتا ہے۔

واٹر پروف میک اپ کا استعمال

گرمیوں میں میک اپ کے بہترین رزلٹ کیلئے ہمیشہ واٹر پروف میک اپکا استعمال کرنا چاہیے خاص مسکارا اور آئی لائنر جو پروف ہوں۔

ہونٹوں کا میک اپ: گرمی میں ہونٹوں پر زیادہ گہرے رنگوں کا استعمال ہرگز نہ کریں گہرے رنگ بے ڈھنگے معلوم ہوتے ہیں ہونٹوں پر ہمیشہ کے لئے رنگوں کا استعمال کریں کیونکہ ہلکے رنگ کی لپ اسٹک آپ کے ہونٹوں کو جاذب نظر بناتی ہے۔

تاثرات: نگر نگر سے

سب سے پہلے اتنا پیارا رسالہ 'خواتین دنیا' لانچ کرنے کے لیے آپ کو ڈھیر ساری مبارکباد۔ اردو کی بقا کے لیے آپ جو محنت کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اس امید کے ساتھ 'خواتین دنیا' کی بزم میں حاضر ہوئی ہوں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ میں نے یہ افسانہ 'بھولی ہوئی یادوں کی کسک' خاص طور سے خواتین دنیا کے لیے لکھا ہے۔ آپ اسے کسی قریبی شمارے میں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ میری اللہ سے یہی دعا ہے کہ یہ رسالہ آسمان میں چمکتا ستارہ بنے۔ ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔ آمین

رضوانہ ساگر روزی، امراوتی، مہاراشٹر

ماہنامہ 'خواتین دنیا' شمارہ ستمبر موصول ہوا۔ رسالہ کی طباعت و اشاعت اور مختلف رنگوں کی آمیز بہت ہی پر کشش ہے۔ مکالکہ کے تحت جو اداریہ لکھا گیا ہے وہ بہت ہی پر معنی ہے نوجوانوں کے تعلق سے آپ نے صحیح فرمایا کہ 'صارفیت زدہ سماج کے آہنی پنجوں میں جکڑے وہ سائنسی آلات کے مایا جال میں جکڑے جا چکے ہیں وہاں سے اسے باہر صرف اور صرف ماں ہی نکال سکتی ہے۔' یقیناً معاشرے کو بہتر اور مضبوط بنانے میں خواتین کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔

'میڈیا اور اردو زبان' مضمون محنت سے لکھا گیا مصنفہ نے اپنے دلائل سے واضح کر دیا ہے کہ اردو اخبارات نے ذہن کی تعمیر و تشکیل میں انقلابی کردار ادا کیا نیز اردو صحافت کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ اس طرح کے مضامین کو خصوصیت سے شائع کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

نعیمہ جعفری کی کہانی 'آخر کب تک' بہت خوبصورت ہے سادہ اور آسان لفظوں میں عورت کے جذبات کی عکاسی بہت ہی پر اثر انداز میں کی گئی ہے کہانی پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہو رہے ہیں اور ذہن پر اپنا خصوصی تاثر قائم کرتی ہے۔ ذاکرہ شیخ کی کہانی 'پیاسی ممتا' بھی بہت ہی پر اثر ہے۔ انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

حسن سخن کے تحت ذکیہ شیخ مینا، خالدہ عظمٰی، حیا لکھنوی، حمیرا رحمان سبھی کی غزلیں دلچسپ ہیں۔

افشاں پروین، ڈھولک پور، اندور، مدھیہ پردیش

ستمبر 2018 کا ماہنامہ 'خواتین دنیا' پورے آب و تاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ دلکش و خوبصورت، عصری آگہی سے بھرپور خواتین کے نئے نئے گوشے اپنے قارئین کی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

رسالہ ملتے ہی اسے ختم کر کے ہی دم لیتی ہوں۔ آپ کا رسالہ عصری خواتین کی سچی تصاویر پیش کر رہا ہے اس میں خواتین مضامین، کہانی اور شاعری کے ذریعہ اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار کرتی ہیں۔ معروف خواتین کے تعلق سے نئی نئی معلومات اور نئے گوشے منظر عام پر آ رہے ہیں اور نئے قلم کاروں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی بھی ہو رہی ہے اور نوجوان خواتین میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ بھی تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔

اس مرتبہ جو رسالہ ملا ہے اس کی بائنڈنگ بہت خراب ہے، جس کی وجہ سے اس کا ظاہری حسن تباہ ہو گیا ہے آپ سے توجہ کی درخواست ہے۔

فلک ناز، رامپور (یوپی)

میں خواتین دنیا کی پرانی قاری ہوں۔ یہ رسالہ پر کشش دیدہ زیب

ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی معیاری اور معلوماتی ہے۔ اس کے اداریے عصری مسائل وعصری حالات کے مطابق تحریر کیے جاتے ہیں۔ ان میں خواتین کی بہتری واصلاح کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام مضمر ہوتا ہے۔ موجودہ سماج ومعاشرہ کی ترقی اور قدیم وصحت مند روایتوں کی بقا کے لیے خواتین کی خدمات، سماج میں خواتین کا مقام اور نوجوان خواتین کی مسلسل حوصلہ افزائی کے لیے خصوصی تذکرے بھی ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ اردو کا واحد رسالہ ہے جس نے خواتین کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ سماج میں اسے برابری کا مقام دلانے کے لیے مسلسل کوشاں نظر آتا ہے۔

کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت بہت ہی محنت سے تحریر کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادب کا برائے راست زندگی سے تعلق ہوتا ہے کوئی بھی ادیب اپنے گردونواح کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بڑا شاعر اپنے تجربات کو بھی اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کو وہ اپنا ہی غم معلوم ہوتا ہے مصنفہ نے صحیح فرمایا کہ 'انھوں نے جو کچھ شعری ونثری ادبی سرمایہ اردو کو دیا ہے وہ ہماری زبان اور مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے۔'

نینا عادل کی نظم 'بقا کی جنگ' بہت ہی آسان وسادہ زبان میں ہجرت سے پیدا ہونے والی اضطرابی کیفیت کی غماز ہے۔ اپنے وطن اور اپنے عزیزوں سے بچھڑنے کے بعد پیش آنے والی پریشانیوں کو بہت ہی خوبصورت اور متاثر کن پیرائے میں بیان کیا گیا۔

آخر ڈینگو کیا ہے؟ بہت معلوماتی مضمون ہے موجودہ موسم میں ڈینگو سے بچاؤ کے لیے کافی اہم تدابیر کا ذکر کیا گیا ایسے معلوماتی مضامین کو ہر ماہ شائع کرنا ضروری ہے۔

نصرین بانو، سیکر، راجستھان

قومی کونسل برائے 'اردو زبان' اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے جس طرح سرگرم عمل ہے وہ قابل تعریف ولائق تحسین ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں نہ صرف اس کے دائرہ کار میں وسعت ہوئی ہے بلکہ تیز رفتاری بھی آئی ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے مختلف اسکیموں کے ساتھ ساتھ ماہنامہ خواتین دنیا کی پابندی سے اشاعت ادارہ کا بڑا کارنامہ ہے جس کے لیے آپ کا پورا ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

میں 'خواتین دنیا' کی بڑی فین ہوں مجھے ہر ماہ اس کا انتظار رہتا ہے رسالہ کی طباعت واشاعت بہت ہی خوبصورت ہوتی ہے مضامین و افسانوی ادب کا انتخاب بھی سلیقہ مندی سے کیا جاتا ہے حسن سخن کے تحت ہمیں نوجوان خواتین کے ساتھ ساتھ بزرگ خواتین کے اشعار کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ متذکرہ شمارہ میں میڈیا اور اردو زبان وکلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت بہت ہی محنت سے تحریر کیے گئے ہیں۔ نعیمہ جعفری کی کہانی آخر کب تک اور ذاکرہ شبنم کی کہانی 'پیاسی ممتا' پڑھ کر آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے امراض کے تعلق سے اگر مسلسل مضامین شائع کیے جائیں تو مفید ہوگا۔ نوجوان خواتین کے کیریر بنانے کے مواقع کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جائے تو نوجوان نسل کی رہنمائی ہو سکے گی۔

ناز پروین، گورکھپور (یوپی)

خواتین دنیا ستمبر 2018 کے تمام مشمولات معیاری ومعلوماتی ہیں اس ماہ آپ نے جو خواتین کو جو پیغام دیا ہے وہ بہت اہم ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری بھی ہے۔ مذکورہ شمارے میں گلشن آرا کا مضمون 'کلیم عاجز کی شاعرانہ عظمت خاصے کی چیز ہے۔ محترمہ نے تنقیدی نقطۂ نظر سے حقائق پر مبنی بڑا ہی وقیع ومعلوماتی جائزہ پیش کیا ہے جو اردو اسکالرس کے لیے بہت کام کی چیز ہے۔ خواتین دنیا وہ واحد رسالہ ہے جس نے خواتین کے حلقہ میں اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ میری کئی سہیلیاں اس میں اپنی غزلیں ومضامین شائع کرانا چاہتی ہیں۔ برائے کرم نئے لکھنے والوں پر خصوصی توجہ فرمائیں۔ ہو سکے تو ان کے لیے خواتین دنیا میں ایک خاص گوشہ مخصوص کر دیں۔ نوازش ہوگی۔

حیا تبسم، دھنباد، جھارکھنڈ

مکرمی! خواتین دنیا رفتہ رفتہ مطالعے کی روٹین کا حصہ بن چکی ہے۔ اب اس کا انتظار رہتا ہے۔ رسالے کے مشمولات میں خواتین کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے لیکن مزید کی طلب بھی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس رسالے سے باورچی خانہ اور آرائش وزیبائش کا حصہ حذف کر دیا جائے تو معلوماتی آرٹیکل کے لیے کچھ اور گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب دور بدل چکا ہے اور بیوٹی ٹپس ہو یا انواع واقسام کے پکوان بنانے کے لیے یوٹیوب کافی سے زیادہ ہے۔

آپ کے اداریے میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ خواتین اپنے مسائل اور اس سے نبرد آزما ہونے کے طریقے پر تحریر قلمبند کریں یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کے ذریعہ خواتین کو اور زیادہ فعال ہونے کے مواقع نصیب ہوں گے۔

خواتین دنیا صوری اور معنوی دونوں طرح سے نہایت کارآمد رسالہ ہے اور میری دعا ہے کہ اس رسالے کو مزید ترقی نصیب ہو۔

فوزانہ مومن، بھیونڈی، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مضامینِ چکبست
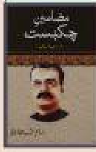

ترتیب وتالیف: آفتاب عالم آفاقی
صفحات: 393
قیمت:-/175 روپے

مغرب میں تنقید کی روایت
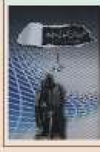

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

من کی بات
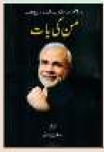

مترجم: سید یاسر علی جیلانی
صفحات: 459
قیمت: 205 روپے

میکرو اکنامکس برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی
صفحات: 196
قیمت: 110 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

منٹو کے نادر خطوط
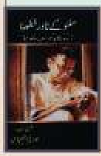

تحقیق وترتیب: فاروق اعظم قاسمی
صفحات: 62
قیمت:-/55 روپے

علی سردار جعفری
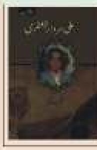

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں
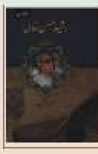

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد ششم)
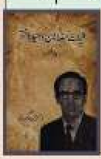

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت:-/115 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

یاس یگانہ چنگیزی

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم واضافہ)

مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت:-/32 روپے

آئینہ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
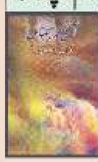

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم
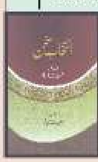

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

اسرارِ کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین وتصحیح متن وترجمہ
وحواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت:-/335 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجرالدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

یہ پیڑ پودے

مصنف: انصار احمد معروفی
صفحات: 52
قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2018, Vol. 02, Issue: 10 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language ISSN 2581-4826
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025